اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

جون ۲۰۲۲ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

نمبر شمار	کتاب	صفحات
	عصری تعلیم کی اصلاح (اسلامی تناظر میں)	
۱	ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
۲	اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
۳	تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۱۶۷
۴	یکساں قومی نصاب۔ خدشات ومضمرات	۲۰۸
۵	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے معلمین	۱۶۰
۶	تدریس القرآن، پارہ ۱، ۲، ۳، ۳۰ برائے طلبہ وطالبات	۴۸
۷	پنج سورہ مع پارہ عم (اُردو تفہیم)	۷۶
۸	ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت	۱۲۰
	طلبہ کی اسلامی تربیت	
۹	تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۲
۱۰	تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
	اصلاحِ دینی مدارس	
۱۱	ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
۱۲	نصابِ مدنیؒ	۴۰
۱۳	مدرسہ ڈسکورسز۔ مطالعہ وتجزیہ	۱۵۶
۱۴	اصلاحِ دینی مدارس	۳۵۲
	اسلامی تحریکیں	
۱۵	پاکستان کی دینی قوتیں غیر موثر اور ناکام کیوں؟	۲۴۰
۱۶	خاموش انقلاب ناگزیر ہے	۲۸۸
۱۷	عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۸۴
۱۸	نئی اصلاحی تحریک کی ضرورت	۷۲
	تزکیۂ نفس	
۱۹	اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
۲۰	حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۲

نمبر شمار	کتاب	صفحات
۲۱	اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۵۶
۲۲	ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۹۲
۲۳	اسلام اور تعمیر سیرت (زیر طبع)	
	اسلام اور مغربی فکر وتہذیب	
۲۴	اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۶
۲۵	اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۶
۲۶	اسلام اور ردِ مغرب	۲۱۶
	تفہیم دین	
۲۷	مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۴۰۰
۲۸	شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۴۸
۲۹	رزم حق وباطل	۸۰
۳۰	اسلام اور پاکستان	۳۰۰
۳۱	عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون	۲۵۰
۳۲	مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۶۷۶
۳۳	مقالاتِ امین (جلد دوم)	۶۴۲
	باللغة العربية	
۳۴	السلطة التشريعية _ دراسة مقارنة	۱۵۰
	English Books	
۳۵	Islamization of Laws in Pakistan	250
۳۶	Riyaz us Saliheen I & II	950
۳۷	Literal Translation of the Holy Quran Para 1-10	500

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔

فون 0309-4607124

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

تدریس القرآن پراجیکٹ

الحمد للّٰہ

الذی بنعمتہ تتم الصالحات

تدریس القرآن پراجیکٹ کے زیر اہتمام لاہور اور پنجاب کے سکولوں میں ادارے کے تیار کردہ پاروں اور ٹیچر گائیڈز کی ترویج جاری ہے۔ مارچ کے آخر تک کے اعداد وشمار:

سکول جن میں تدریس القرآن پڑھایا جارہا ہے	۷۶۰
طلبہ وطالبات جوان سکولوں میں ترجمہ قرآن سیکھ رہے ہیں	۷۰,۰۰۰
ماسٹر ٹرینرز اور اساتذہ جن کو اس مقصد سے ٹریننگ دی گئی	۳۶۰۰
کل تعداد طباعت پارہ ①، پارہ ③، پارہ ⑥	۱,۲۰,۰۰۰

دعا اور تشجیع کی درخواست کے ساتھ

چیئرمین (اعزازی): محمد منشا طور — سی ای او (اعزازی): پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

سی او او (اعزازی): پروفیسر ایم اے رفرف

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: 0322-8614998 0300-410728 ermpak@hotmail.com

ماہنامہ
البرھان
لاہور

جلد۲۶، شمارہ ۶، جون ۲۰۲۲ء/ ذی القعدہ ۱۴۴۳ھ

مشمولات

○فکرونظر
عمران خاں صاحب کے نام کھلا خط ۴
○مقالۂ خصوصی
پاکستان میں شریعت کیوں نافذ نہیں ہوسکی؟ ڈاکٹر محمد امین ۷
○تعلیم وتربیت
- لبرل انتہا پسندی اور ہمارا نصابِ تعلیم ونصابی کتب محمد آصف خان ۲۶
- اسرائیل کے تعلیمی نصاب کی ایک جھلک رضی الدین سیّد ۲۹
- نیشنل کریکلم کونسل کی تشکیل نو کی جائے مدیر ۳۸
- جامعات کی پی ایچ ڈی پر نظر ڈاکٹر شہزاد اقبال شام ۳۹
○اسلام اور تجدد
اجتہاد اور تجدید جائز۔ تجدد نا قابلِ قبول ڈاکٹر محمد امین ۴۱
○اسلام اور پاکستان
- سود اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف منظم تحریک کی ضرورت مدیر ۴۹
- بچوں کو اگلی صفوں سے مت نکالیے ڈاکٹر مفتی امیر حمزہ ۵۶
- رشتوں کو جوڑنے کی تحریک پروفیسر محمد عاصم حفیظ ۵۸
○تفہیم مغرب
دنیا کی تباہی میں صرف تین برس رہ گئے سید خالد جامعی ۵۹
○اسلام اور مغرب
امریکہ اور یورپ میں شادی کا روایتی ادارہ ختم ہو رہا ہے سید خالد جامعی ۶۰
○پاکستانیات
شدید گرمی اور پانی کی قلت۔ ہم کب سوچیں گے؟ ادارہ ۶۴
○فہم دین
- معیشت واخلاق کا باہمی تعلق مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ ۶۶
- اسلام میں اختلافات کی حدود اور منہج مولانا مفتی محمد شفیعؒ ۸۱

مدیر
ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر
ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری
حافظ عمران رضا طحاوی

لیگل ایڈوائزر
محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 70 روپے
سالانہ 800 روپے۔ پانچ سال: 4000 روپے
تاحیات 15,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ
15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

فکر و نظر ۱۳ مئی ۲۰۲۲ء

عمران خاں صاحب کے نام کھلا خط

گرامی قدر خان صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

* آپ تک ذاتی رسائی نہ رکھنے کی وجہ سے یہ کھلا خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ شاید کسی طرح آپ تک پہنچ جائے۔

* عرض ہے کہ آپ نے جو رستہ چنا ہے اس کا انجام بظاہر تخت یا تختہ ہوگا جو دونوں صورتوں میں آپ کو کامیابی تک لے جائے گا بشرطیکہ آپ اللہ کے لیے اور اپنی کاز میں مخلص ہوں۔ ہم اگرچہ سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں لیکن چونکہ ہمارا دین ہمیں 'الدین النصیحہ' کا حکم دیتا ہے اس لیے دل چاہا کہ آپ سے کچھ باتیں کر لی جائیں خواہ ان کا نتیجہ کچھ نکلے یا نہ نکلے وبیدہ اللہ التوفیق۔

* محترم خان صاحب! حقیقت یہ ہے کہ آپ ساڑھے تین سالہ دورِ حکومت میں ناکام ہو گئے اور اپنے اعلان کردہ بڑے کاموں جیسے کرپشن کا خاتمہ، انصاف کی فراہمی، معاشی خوش حالی، یکساں نصاب تعلیم وغیرہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ کو اس ناکامی پر گہری سنجیدگی سے، خود کو کوئی الاؤنس دیئے بغیر، غور کرنا چاہیے۔ ہماری رائے میں اس ناکامی کے اسباب اگرچہ متعدد ہیں لیکن ان میں سے دو اہم تر ہیں۔ ایک یکسو اور قابل ٹیم کا نہ ہونا اور دوسرے آؤٹ آف باکس فیصلے کرنے کی صلاحیت نہ ہونا اور ہمت نہ کرنا۔

ہم اختصار کی خاطر صرف دو مثالیں پیش کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ جن پاکستانیوں کے ووٹوں اور حمایت سے آپ کامیاب ہوئے اور آئندہ ہوں گے ان کی ۹۰ فی صد اکثریت غریب ہے اور اسلام سے محبت کرتی ہے۔ آپ کو سارے فیصلے اس ۹۰ فی صد اکثریت کے لیے کرنے چاہئیں مثلاً عوام کو مہنگائی سے نجات دلانے کا حل یہ نہیں تھا کہ IMF سے سخت شرائط پر

قرض لیا جاتا تاکہ اہل مغرب کا سودی قرضہ واپس کیا جا سکتا بلکہ آؤٹ آف باکس فیصلہ کر کے Planned Default تھا جیسا کہ لاطینی امریکہ کے کئی ممالک نے کیا۔ ہم نے اس پر اپنے ماہنامہ'البرہان' میں کئی دفعہ تفصیل سے لکھا کہ یہ معاشی خوش حالی کا واحد راستہ ہے کہ مغرب کو قرضوں کی واپسی وقتی طور پر روک دی جائے اور سارا بجٹ عوام کی بہبود پر لگا دیا جائے لیکن غالباً ہماری آواز آپ تک پہنچی ہی نہیں۔

دوسری مثال یکساں نظام تعلیم کی ہے۔ آپ کا وزیر تعلیم کا انتخاب ہی صحیح نہ تھا کیونکہ شفقت محمود صاحب معروف سیکولر اور لبرل آدمی ہیں۔ انہوں نے ۹۰ فی صد غریب اور اسلام پسند عوام اور آپ کی اسلام سے محبت کا لحاظ کرنے کی بجائے یکساں نظام تعلیم کی بنیاد ہیومنزم اور سیکولرزم پر رکھی اور مغرب زدہ سرمایہ داروں، تاجروں اور ان کے ایلیٹ کلاس سکولوں کے لیے اسے یکساں بھی نہ رہنے دیا۔ ہم نے اس بارے میں اتنے مضامین لکھے کہ ایک کتاب بن گئی (اور چھپ بھی گئی) لیکن ہماری آواز آپ تک نہ پہنچ سکی۔

* ماضی کے اس مختصر ذکر کے بعد (کہ دیگ کے چند دانے ہی اس کا ذائقہ بتانے کے لیے کافی ہوتے ہیں) اب آیئے موجودہ صورت حال کی طرف۔ ہم آپ کی مصروفیت کے پیش نظر اور اس خط کو مختصر رکھنے کے لیے صرف دو انتہائی ضروری باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائیں گے:

۱۔ امریکی استعمار کے خلاف جدوجہد پر آپ کو مبارکباد لیکن یہ جدوجہد صرف سیاسی نہیں رہنی چاہیے بلکہ اسے تہذیبی، تعلیمی، معاشی، معاشرتی اور عدالتی.... بھی ہونا چاہیے مطلب یہ کہ آپ ابھی یہ اعلان کر دیجیے کہ آپ معیشت کو مغرب کے چنگل سے نکالنے کے لیے آؤٹ آف باکس فیصلے کریں گے۔ تعلیم کو، معاشرتی اقدار کو، نظام عدالت کو، اتحاد امت کو۔۔۔ سب کو مغربی فکر و تہذیب کے چنگل سے اور امریکہ و مغربی ملکوں کے دباؤ سے نکالنے کے لیے آؤٹ آف باکس فیصلے کریں گے۔

۲۔ آپ موجودہ جدوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو ۹۰ فی صد غریب اور اسلام پسند عوام کی پرزور حمایت حاصل نہ ہو۔ اس کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ آپ ابھی ان

کے لیے متعدد ایسے پرکشش اقدامات کا اعلان کریں تاکہ ۹۰ فی صد غریب اور اسلام پسند عوام کا ووٹ بینک آپ کی حمایت میں کھڑا ہو جائے مثلاً یہ کہ آپ مغرب کو قرضوں کی واپسی سے وقتی انکار کر کے سارا بجٹ عوام کی بہبود پر لگا دیں گے اور مہنگائی ختم کر دیں گے۔ میڈیا سے فحاشی اور عریانی ختم کر دیں گے۔ موجودہ عدالتی نظام کو بدل دیں گے، نظام تعلیم و تربیت میں قرآن و سنت اور سیرت کی تعلیم لازمی کر دیں گے۔ ختم نبوت اور حرمت رسول پر جان قربان کر دیں گے۔ فرانس کے سفیر کو نکال دیں گے۔ اس کے لیے آپ ابھی یہ اعلان بھی کر دیں کہ آئندہ آپ کے جلسوں میں خواتین کا انکلوژر مردوں سے الگ ہوگا اور خواتین محفوظ ہوں گی وغیرہ۔

ان اقدامات سے، ہمیں توقع ہے کہ ۹۰ فی صد اسلام پسند اور غریب عوام آپ کو ہیرو مان لیں گے اور ان کا ووٹ بینک آپ کی جھولی میں آ گرے گا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ آپ کو دوبارہ اقتدار عطا فرمائے تو پھر ان باتوں پر عمل کی نیت اور عزم بھی رکھیں اور پاکستان کو سچ مچ کی ریاست مدینہ بنا کر دکھا دیں۔

ان باتوں پر عمل کی نصیحت اپنے ساتھیوں اور جماعت کو بھی کریں۔

اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو اور آپ کو دنیا و آخرت میں کامیابی عطا فرمائے۔

خیر اندیش،

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

پی ایچ ڈی: پنجاب یونیورسٹی و امریکہ۔ ایم فل: سعودی عرب۔ ڈپلومہ: یونیورسٹی آف کیمبرج
سابق پروفیسر: بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، پنجاب یونیورسٹی، یو ایم ٹی، لاہور
مدیر ماہنامہ البرھان لاہور، مصنف اسلامی موضوعات پر 37 علمی و تحقیقی کُتب
صدر تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ، جنرل سیکریٹری ملی مجلس شرعی (تمام دینی مکاتب فکر کی علمی مجلس)

مقالۂ خصوصی		ڈاکٹر محمد امین

پاکستان میں شریعت کیوں نافذ نہیں ہو سکی؟ کیسے نافذ ہو سکتی ہے؟

مفہوم کی غلطی

تفصیل میں جانے سے پہلے ابتداء ہی میں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ''نفاذ شریعت'' سے ہماری کیا مراد ہے؟

اس سے محض یہ مراد نہیں ہے کہ پاکستان کے قوانین اسلام کے مطابق ہو جائیں یا دوسرے لفظوں میں پاکستانی حکمران موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھال دیں یا آئندہ جو بھی قوانین بنائیں وہ اسلام کے مطابق ہوں۔ کیونکہ پاکستان میں بہت سے قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالا جا چکا ہے اور پاکستان میں بہت سے اسلامی قوانین موجود ہیں لیکن کوئی ان پر عمل نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۹ء سے ہمارے ہاں 'حدود اللہ' بھی نافذ ہیں لیکن نہ انتظامیہ ان اسلامی قوانین پر عمل کرتی ہے اور نہ عدلیہ ان سے عمل کراتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ اسلامی قوانین کاغذوں میں تو موجود ہیں لیکن ان پر ریاست اور ریاستی ادارے عمل نہیں کرتے۔ گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں شریعت عملاً نافذ نہیں ہے۔

ہم جو کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ نفاذ شریعت کا یہ مفہوم صحیح نہیں ہے کہ اس سے مراد محض ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہے۔ اس کے لیے بعض دیگر اصلاحات بھی ہمارے ہاں مروج ہیں جیسے نفاذ اسلام، اسلامی انقلاب، نظامِ مصطفیٰ، غلبۂ دین، اقامتِ دین، اسلامی نظام زندگی وغیرہ۔ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ ان اصطلاحات کا مفہوم یہ ہے کہ ملک کا آئین اور قوانین اسلامی ہو جائیں تو یہ غلط ہے۔ جیسا کہ بعض دینی رہنما یہ اعلان کرتے رہے ہیں کہ اگر حکومت ہمیں دے دی جائے تو ہم چوبیس گھنٹے میں شریعت نافذ کر دیں گے یا اسلام نافذ کر دیں گے۔ اسے نعرہ یا بڑھک تو قرار دیا جا سکتا ہے لیکن عمل کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ چوبیس گھنٹے میں آپ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ ملک کے آئین اور قوانین کو اسلامی بنانے کا اعلان کر دیں لیکن اس سے شریعت عملاً تو ملک میں نافذ نہیں ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں بعض دینی جماعتیں قیام پاکستان کے بعد

''آئین کو اسلامی بناؤ'' اور ''قوانین کو اسلامی بناؤ'' کے نعرے لگایا کرتی تھیں، اب انہوں نے یہ نعرے لگانے چھوڑ دیئے ہیں کیونکہ وہ دیکھ چکی ہیں کہ آئین کی بہت سی شقیں اسلامی ہیں اور ملک میں بہت سے قوانین اسلامی ہیں لیکن اس کے باوجود عملاً شریعت نافذ نہیں ہو سکی اور نہ شریعت نافذ ہونے سے حاصل ہونے والے نتائج معاشرے میں موجود ہیں۔

خلاصہ یہ کہ نفاذ شریعت سے محض یہ مراد نہیں ہے کہ آئین اور قوانین اسلامی ہو جائیں کیونکہ اگر آئین اور قوانین اسلامی ہو بھی جائیں لیکن ان پر عمل کرنے اور کرانے والا کوئی نہ ہو تو ظاہر ہے عملاً شریعت نافذ نہ ہو گی۔

نفاذِ شریعت کا صحیح مفہوم

نفاذ شریعت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

دیکھیے! انسانی زندگی کی دو بڑی جہتیں ہیں: انفرادی زندگی اور اجتماعی زندگی۔ پھر اجتماعی زندگی کے دو بڑے دائرے ہیں معاشرہ اور ریاست۔ جب ہم کہتے ہیں کہ پاکستان میں شریعت نافذ ہونی چاہیے (یا پاکستان میں اسلامی انقلاب آنا چاہیے یا پاکستان میں نظام مصطفیٰ ہونا چاہیے، یا پاکستان میں دین کا غلبہ ہونا چاہیے یا پاکستان میں اسلامی نظام زندگی نافذ ہونا چاہیے یا پاکستان میں اقامت دین ہونی چاہیے وغیرہ) تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے (اور یہی ہونا چاہیے) کہ پاکستانی مسلمان اپنی انفرادی زندگی میں دین پر عمل کریں، پاکستانی معاشرہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرے اور اسی طرح پاکستانی ریاست اسلامی تعلیمات پر عمل کرے۔ اور چونکہ معاشرہ انسانوں اور افراد ہی سے مل کر بنتا ہے اور ریاست کو بھی انسان اور افراد ہی چلاتے ہیں۔ لہٰذا بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے فرد کو شریعت کا پابند بنایا جائے۔ اور انسان کوئی مشین یا روبوٹ نہیں ہوتا کہ اسے حکم دیا جائے اور جس طرح اسے کرنے کا حکم دیا جائے وہ اس طرح کرنا شروع کر دے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گوشت پوست کا جیتا جاگتا انسان بنایا ہے، اسے عقل وشعور عطا کیا ہے، اس میں جذبات رکھے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ تعلیم وتربیت سے مسلمان فرد کی ایسی ذہن سازی کی جائے، اس کی ایسی تعمیر سیرت کی جائے کہ وہ اپنی خوشی سے اور اپنی مرضی سے اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے لگے اور نہ صرف اپنی انفرادی زندگی میں ایسا کرے بلکہ معاشرے میں اس کا جو رول ہے وہ اسے بھی اسلامی تقاضوں کے مطابق سرانجام دے اور اس طرح ریاست میں اس کی جو ذمہ

داریاں ہیں ان میں بھی وہ اپنی خوشی اور رضامندی سے اسلامی تعلیمات پر عمل کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب پاکستان میں ہر فرد اپنی انفرادی زندگی میں، اپنی خوشی اور رضامندی سے اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے لگے اور معاشرے میں اپنا رول اور ریاست میں اپنی ذمہ داری بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق ادا کرنے لگے یعنی ہر پاکستانی مسلمان عملاً ایک یک سُو عملی (PRACTICING) مسلمان بن جائے، معاشرہ اسلامی اصول واقدار پر عمل کرنے لگے اور ریاست اسلامی تعلیمات اور تقاضوں پر عمل کرنے لگے تو پھر ہی ہم کہہ سکیں گے کہ پاکستان میں شریعت نافذ ہوگئی ہے یا پاکستان میں اسلام نافذ ہوگیا ہے یا یہاں اسلامی نظام زندگی قائم ہوگیا ہے یا یہاں دین غالب ہوگیا ہے۔

یہ ہے پاکستان میں نفاذ شریعت کا صحیح مفہوم۔

پاکستان میں شریعت کیوں نافذ نہیں ہوسکی؟

آیئے اب اس پر غور کریں کہ نفاذ شریعت کی جو تعریف ہم نے کی ہے، پاکستان میں اس کے مطابق آج تک شریعت کیوں نافذ نہیں ہوسکی؟

اس کے متعدد اسباب ہیں۔ سہولت بیان کی خاطر یہ مناسب ہوگا کہ ہم اس میں ان طبقات کا کردار زیر بحث لائیں جو اس سے متعلق ہیں یعنی ۱۔ علماء کرام اور دینی قوتیں ۲۔ حکمران اور حکمران طبقات ۳۔ مسلم عامتہ الناس ۴۔ بین الاقوامی طاقتیں

۱۔ علماء کرام اور دینی قوتیں

بظاہر یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ پاکستان کے دینی لوگ اور دینی جماعتیں ہی نفاذ شریعت کا مطالبہ کرتی ہیں اور ہم انہیں ہی عدم نفاذ شریعت کے ذمہ داروں میں سرفہرست رکھ رہے ہیں۔ یہ بات تلخ اور عجیب ضرور ہے لیکن بہر حال حقیقت یہی ہے اور اس تحریر کے مطالعہ کے بعد قارئین، ان شاء اللہ، ہمارے نقطۂ نظر سے اتفاق کریں گے۔ پاکستان کی دینی قوتوں کے اس طرزِ عمل کو تین پہلوؤں سے زیر بحث لایا جاسکتا ہے۔

۱۔ غیر متوازن اور جزوی تصور دین

۲۔ عدم اتحاد

۳۔ ہوم ورک نہ ہونا

اب ہم ان کی کچھ تفصیل عرض کرتے ہیں:

غیر متوازن اور جزوی تصور دین

غیر متوازن اور جزوی تصور دین کے مظاہر اور اطلاقات کو ہم جدید دینی تحریک اور روایتی علماء کرام کے اداروں اور جماعتوں جیسے دینی مدارس، تبلیغی جماعت اور دینی سیاسی جماعتوں کے حوالے سے زیر بحث لائیں گے۔

جدید دینی تحریک (جیسے جماعت اسلامی، تنظیم اسلامی، تحریک اسلامی اور خلافت کی علمبردار دینی تنظیمیں)۔

جدید دینی تحریک کے ہاں غیر متوازن اور جزوی تصور دین کے تین بڑے مظاہر ہیں:

۱۔ نفاذِ شریعت بذریعہ سیاسی جدوجہد

۲۔ نفاذِ شریعت بذریعہ'اسلامی جمہوریت

۳۔ نفاذِ شریعت بذریعہ اسلامی قوانین

۱۔نفاذِ شریعت بذریعہ سیاسی جدوجہد

یہ تحریک اگرچہ قیامِ پاکستان سے پہلے اسلام کو مکمل نظام زندگی کے طور پر پیش کرتی تھی اور فرد اور معاشرے کی اصلاح کے ذریعے ہی اسلامی ریاست کے قیام کو ممکن سمجھتی تھی لیکن قیام پاکستان کے بعد جب اسے پاکستان میں عملاً کام کرنے کا موقع ملا تو اس نے ''فرد، معاشرے اور ریاست کی اصلاح'' اور ''قیام اسلامی ریاست بذریعہ اصلاحِ فرد اور معاشرہ'' کا راستہ ترک کر دیا اور ''قیام اسلامی ریاست بذریعہ سیاسی جدوجہد'' کا طریقہ اپنا لیا۔ یہ طریقہ خلافِ عقل و منطق بھی تھا (کہ مغربی جمہوریت کے مطابق [جو پاکستان میں رائج تھی] جن لوگوں کی حمایت سے اور جن کے ووٹ سے انہوں نے اسلام کے لیے اقتدار حاصل کرنا تھا، انہوں نے انہیں اپنا حامی اور ہم خیال بنانے کی بجائے اور معاشرے کی حمایت اور اصلاح کے بغیر محض سیاسی جدوجہد سے

برسرِاقتدار آنا چاہا) اور خلافِ ترجیحاتِ اسلام بھی (کیونکہ قرآن تبدیلی کی بنیاد ’’یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ‘‘ یعنی تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس کو بناتا ہے اور اسی پر عمل کر کے اللہ کے آخری رسول ﷺ نے افراد کی تربیت کی اور ان کے ذریعے معاشرے اور ریاست کو اسلامی خطوط پر قائم کیا)۔ لہٰذا نقل وعقل دونوں کی رو سے اس تصورِ دین اور اس حکمت عملی کا ناقص اور غیر متوازن ہونا اور اس کا ناکام ہونا ظاہر و باہر تھا۔

۲۔ نفاذِ شریعت بذریعہ ’اسلامی جمہوریت‘

اسلام کی بنیاد ’لا الہ الا اللہ‘‘ پر ہے یعنی پہلے ان خداؤں کا انکار جو درحقیقت خدا نہیں ہیں اور اس ایک خدا کا اقرار جو معبود ومطاع حقیقی ہے۔ نفی کے بغیر اثبات بے معنی ہے اور قرآن کے نزدیک ناقابل قبول بھی۔ اور مغربی فکر وتہذیب کے خلافِ اسلام ہونے بلکہ خالص جاہلیت ہونے کا اقرار اور دعویٰ تو اس تحریک کے لوگ قیام پاکستان سے پہلے بھی کرتے تھے لیکن قیام پاکستان کے بعد جب انہوں نے ’’اقامتِ دین بذریعہ سیاسی جدوجہد‘‘ کا راستہ اپنایا اور ملک میں پچھلے دو سو سال سے انگریز استعمار نے جو ہندوستان میں جمہوریت رائج کر رکھی تھی (اور وہ مغربی فکر وتہذیب کے مطابق سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت تھی) وہی پاکستان میں رائج تھی تو اس تحریک نے سیاسی میدان میں رہنے اور ’’اقتدار برائے اسلام‘‘ کے لیے جدوجہد کرنے کی خاطر اس غیر اسلامی جمہوریت کو اس میں چند اسلامی اصول کا غذی طور داخل کرا کے اسے ’’اسلامی جمہوریت‘‘ قرار دے دیا۔

ظاہر ہے یہ بات بھی خلاف نقل وعقل تھی۔ نقل کا تقاضا یہ تھا کہ ملک کے سیاسی نظام کو پہلے مطابقِ اسلام بنایا جاتا اور پھر ہی یہ ریاست اسلامی اصولوں پر چل سکتی۔ رویہ خلافِ عقل ومنطق اس لیے تھا کہ یہ جمع اضداد کے مصداق تھا۔ جمہوریت جس ورلڈ ویو کی پیداوار تھی وہ توحید، رسالت، آخرت کی نفی کرتا ہے۔ یہ مغرب کے تصورِ علم کی پیداوار تھی جس کی بنیاد انکار وحی پر ہے۔ تو اس کافرانہ اور غیر اسلامی جمہوریت کو مطابقِ اسلام بنایا ہی نہیں جا سکتا تھا اور اگر کوئی ایسی غیر عقلی حرکت کرتا بھی تو مغربی جمہوریت کے بنیادی اصول واقدار ہی کو غالب ہونا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلے ۷۵ سال میں پاکستان میں ’’اسلامی جمہوریت‘‘ کے نفاذ سے پاکستانی معاشرے اور ریاست میں سیکولرازم، لبرل ازم، کیپٹل ازم وغیرہ کی اقدار غالب آ گئی ہیں اور

اسلامی اقدار پسپا ہوگئی ہیں۔ایسا اچانک یا حادثے کے طور پرنہیں ہوا بلکہ یہ بالکل عقلی اور منطقی نتیجہ ہے مغرب کی الحادی وسرمایہ دارانہ جمہوریت کو''اسلامی جمہوریت''میں بدلنے کا۔

یہ ہم جو کہہ رہے ہیں کہ مغرب کی سیکولر،لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کو'اسلامی جمہوریت' نہیں بنایا جا سکتا۔وہ نظری طور پر تو صحیح تھا ہی،پچھلے ۷۵ سال کے عملی نتائج نے بھی اس کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔اب اس کے باوجود جو'اسلامی جمہوریت' کے ذریعے پاکستان میں نفاذِ شریعت کے خواب دیکھے اسے اپنی''بصیرت''کا علاج کرانا چاہیے۔

۳۔ نفاذِ شریعت بذریعہ اسلامی قوانین

اس دینی تحریک نے چونکہ نفاذ اسلام بذریعہ سیاسی اقتدار کے دینی تصور اور دینی حکمت عملی کو اپنالیا تھا لہٰذا اس کی تاریخ کا مطالعہ کر لیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ ہمیشہ سے آئین اور قوانین کو اسلامی بنانے پر زور دیتی رہی ہے،اس پر اصرار کرتی رہی ہے اور اس کے لیے مہمیں چلاتی رہی ہے۔اور ہمیں یاد ہے کہ جب 1979ء میں جنرل ضیاء الحق نے اسلامی حدود(کاغذوں میں) نافذ کردیں تو ایک جشن کا سماں تھا۔تحریک کے لوگ مٹھائی کے ڈبے لے کر بانی تحریک اسلامی کے دفتر پہنچے کہ انہوں نے جو خواب دہائیوں پہلے دیکھا تھا،ان کی آنکھوں کے سامنے اس نے عملی شکل اختیار کرلی ہے۔بانی تحریک نے بھی اللہ کا شکرادا کیا۔لیکن تلخ حقیقت یہ ہے کہ قوانین اسلامی بنا دینے سے نہ فرد اچھا مسلمان بنا،نہ معاشرہ اسلامی بنا اور نہ ریاست''اسلامی ریاست''میں تبدیل ہوئی۔حدود قوانین کو پاس ہوئے ۴۳ سال گزر چکے لیکن آج تک پاکستان میں ایک حد بھی نافذ نہیں ہوئی اور فرد،معاشرہ اور ریاست اس وقت اخلاقی بگاڑ کی انتہا پر ہے۔

صرف ایک مثال دے کر ہم اس بحث کو ختم کرتے ہیں کہ ہمارا تعلق شعبۂ تعلیم سے ہے چنانچہ ہم اس تحریک کے تعلیم سے متعلق کارکنوں سے ساری زندگی یہ مطالبہ اور یہ نعرہ سنتے رہے کہ ''نظامِ تعلیم کو اسلامی بناؤ''،لیکن ظاہر ہے کسی حکومت نے اسے اسلامی بنانا تھا،نہ بنایا۔لیکن یہ کہانی اس سے زیادہ دردناک ہے اور وہ یوں کہ بالآخر نظام تعلیم میں پرائیویٹ سیکٹر کو کھلی چھوٹ دے دی گئی۔چنانچہ اس تحریک کے ہزاروں لوگوں نے دیگر افراد معاشرہ کی طرح سکول،کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرلیں لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے تعلیمی اداروں میں

'اسلامی نظام تعلیم' نافذ نہیں کیا بلکہ ان کے تعلیمی ادارے دوسرے لوگوں کے اداروں کی طرح ہی مغربی فکر وتہذیب کو فروغ دے رہے ہیں، انہیں نامسلم اور مغرب زدہ بنا رہے ہیں اور ان میں دنیاوی لحاظ سے کئی خوبیاں ہیں لیکن ان میں اگر کوئی چیز نہیں ہے تو وہ اسلام ہے۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ نہ اچانک ہوا ہے اور نہ حادثہ ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے اس غیر متوازن اور جزوی تصور دین کا جس کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ روایتی علماء کرام اور دینی جماعتیں (دینی مدارس، دینی اصلاحی جماعتیں اور دینی سیاسی جماعتیں)

غیر متوازن اور جزوی تصور دین کے روایتی علماء کرام کی جماعتوں اور اداروں میں کئی مظاہر ہیں جیسے دین ودنیا میں تفریق، مغربی فکر وتہذیب کو اپنانا اور مسلک کو دین بنا لینا اور فرقہ واریت، اور یہ نفاذ شریعت میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔

دینی مدارس

چونکہ اسلام میں دین ودنیا میں کوئی تفریق نہیں بلکہ دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق گزارنا ہی دین ہے، اس لیے اسلامی نظام تعلیم میں کبھی دین ودنیا کی تفریق نہیں رہی اور نہ کبھی وہاں دین ودنیا کی ثنویت اور دوئی (Dichotomy) رہی ہے۔ سارے مسلمان دین کی ضروری تعلیم حاصل کرتے تھے اور لکھنا پڑھنا سیکھتے تھے۔ پھر جو چاہتا اپنی پسند کے شعبے میں اعلیٰ قابلیت حاصل کر لیتا۔ اس کی ہم چند مثالیں عرض کرتے ہیں۔ امام فخر الدین رازیؒ، مفسر، محدث، فقیہ اور متکلم بھی تھے اور ساتھ ہی طبیب (Medical Doctor)، ہیئت دان (Astrologist) اور ماہر کیمیا (Chemist) بھی تھے۔ بوعلی سینا عالمی شہرت یافتہ طبیب تھے لیکن دین کے عالم بھی تھے۔ اکبر و جہانگیر کے وزیر اعظم سعد اللہ خاں، تاج محل جیسا شاہکار تخلیق کرنے والے آرکی ٹیکٹ احمد معمار لاہوری اور مجدد الف ثانی کہلانے والے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ تینوں ہم جماعت تھے۔

غرضیکہ پہلی جنگ عظیم میں شکست کھانے اور خلافت کے خاتمے سے پہلے بارہ تیرہ سو سال تک مسلمانوں کا نظام تعلیم دینی اور دنیاوی تعلیم کے لیے ایک ہی ہوتا تھا۔ عالم گیر کے عہد آخر میں

ملا نظام الدینؒ نے جو نصاب مدون کیا (اور جو ان سے منسوب درس نظامی کہلاتا ہے) اس میں تفسیر وحدیث کی صرف ایک ایک کتاب تھی اور باقی نصاب عمرانی وسائنسی علوم پر مشتمل تھا اور اس وقت کے مسلم معاشرے اور ریاست کے لیے افرادِ کار مہیا کرتا تھا۔ یہ مسلم تاریخ میں پہلی دفعہ ہوا کہ انگریزوں سے شکست کھانے اور ہندوستان کے دارالکفر میں تبدیل ہوجانے کے بعد مدرسہ دیوبند نے جو نصاب جاری کیا وہ صرف مذہبی علوم پر مشتمل تھا (اگرچہ بانیانِ مدرسہ کو اس خامی کا احساس تھا اور انہوں نے کئی مواقع پر اس امر کی اصلاح کی کوشش بھی کی)۔ اس عارضی نصاب ونظام کے لیے بانیانِ مدرسہ کے پاس کئی حقیقی عذر تھے (جیسے انگریز حکومت کے لیے افرادِ کار تیار نہ کرنا۔ انگریزوں کے ہاتھوں مسلم نظام تعلیم کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والے گھمبیر خلا کو جزواً ہی سہی پورا کرنا تاکہ ہندوستان کا حشر اندلس جیسا نہ ہو، وسائل کی عدم فراہمی وغیرہ) لیکن اس عارضی کیفیت کا خاتمہ ضروری تھا اور پاکستان جیسی آزاد مملکت کے وجود میں آنے کے بعد اس نصاب ونظام کے جاری رہنے کا کوئی جواز نہ تھا لیکن دینی مدارس چلانے والوں نے اسے تبدیل کرنا ضروری نہ سمجھا بلکہ مزید وسائل کی فراہمی کے لیے اپنے کام کو تقدس اور عین شرعی تقاضا قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دینی مدارس کا دیوبند ماڈل مزید مستحکم ہوگیا۔ اور اب سارے دینی مکاتب فکر کے مدارس اسی ماڈل کے مطابق کام کرتے ہیں خواہ وہ حنفی بریلوی ہوں، اہل حدیث ہوں، اہل تشیع ہوں یا جماعت اسلامی کے مدارس ہوں۔

خلاصہ یہ کہ دینی مدارس کا، دین ودنیا کی تفریق پر مبنی، موجودہ نظامِ تعلیم ملاّ نظام الدینؒ کے مرتب کردہ درس نظامی کے بالکل برعکس ہے۔ یہ مسلمانوں کی متفقہ بارہ سوسالہ تعلیمی روایت کے بھی خلاف ہے اور اسلام کے مکمل نظامِ حیات ہونے اور اس کے لیے مطلوب افراد تیار کرنے کے بھی خلاف ہے۔ ہم یہ بات عرصہ سے کہہ رہے ہیں۔ ہم نے یہ بات دینی مدارس سے متعلق اپنی چار کتابوں میں مدلل انداز میں مختلف اسالیب سے کہی ہے لیکن کوئی ہماری بات پر کان دھرنے کو تیار نہیں۔

نفاذِ شریعت کا اس بات سے تعلق یہ ہے کہ دینی مدارس کا نظام تعلیم ایسے افراد تیار ہی نہیں کرتا جو موجودہ معاشرے اور ریاست کو اسلامی بنا سکیں یا اس میں کوئی کردار ادا کرسکیں۔ وہ صرف مسجد اور مدرسہ کے لیے ''مولوی صاحب'' تیار کرتا ہے۔

ایک اوراہم بات ۔دینی مدارس کا یہ تعلیمی ماڈل اوراس کے چلانے والے علماء کرام ملک میں موجودمغرب زدہ جدیدنظام تعلیم کی اصلاح کرنے یااس میں پڑھنے والے کروڑوں مسلمان طلبہ کی دینی تعلیم وتربیت کا کوئی اہتمام نہیں کرتے اور نہ اس کے لیے تیار ہیں حالانکہ جدیدنظام تعلیم سے فارغ ہونے والے طلبہ ہی معاشرہ اور ملک چلاتے ہیں۔یوں یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ہمارے روایتی علماء کرام نے اس امر کا پورااہتمام کررکھا ہے کہ ایسے افراد تیار نہ ہوں جوملک میں شریعت نافذ کرسکیں اور جدیدنظام تعلیم کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے کہ وہ ایسے کروڑوں افراد تیار کرے جواس معاشرے اور ریاست کوغیراسلام (یعنی مغرب کی الحادی فکروتہذیب کے مطابق) چلاتے رہیں۔یہ بات تلخ اورناقابلِ یقین ہے لیکن ہے بہرحال حقیقت۔

دینی اصلاحی جماعتیں

جن لوگوں نے تبلیغی جماعت بنائی وہ مدرسہ دیوبندہی کے فارغ التحصیل تھے چنانچہ دین ودنیا کی جس تفریق کی طرف ہم نے سطور بالا میں دینی مدارس کے حوالے سے ذکر کیا ہے،وہی تصورِدین تبلیغی جماعت میں بھی غالب ہے۔

چنانچہ تبلیغی جماعت جواس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور کامیاب دینی تحریک ہے وہ لوگوں کے کلمے سیدھے کرانے،انہیں نماز،روزے کا پابند بنانے اورانہیں'اسلامی'لباس اورحلیہ اختیارکرانے (جیسے ٹوپی،داڑھی،شلوارقمیص وغیرہ) میں کامیاب ہے لیکن پاکستان کے نیک اور متقی تبلیغی بھائیوں کواس بات سے کوئی غرض نہیں کہ پاکستان کا نظام تعلیم اسلامی ہے کہ نہیں؟ یہاں سیاسی،معاشی،عدالتی،معاشرتی اورمیڈیا کانظام اسلامی ہے یانہیں؟سیکولرزم اورلبرل ازم مسلمانوں اوران کی نئی نسلوں کوکافر بنارہے ہیں یامسلم؟انہیں کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔انہیں صرف ایک بات سے دلچسپی ہے اوروہ ہے ان کے تصورِدین کے مطابق تبلیغ۔یہاں تک کہ وہ اپنے محدوددائرے میں بھی نہی عن المنکر کے لیے تیارنہیں۔یہی حال حنفی بریلوی مسلک کی'دعوت اسلامی'اوردوسری دینی اصلاحی تحریکوں کا ہے۔

دینی سیاسی جماعتیں

روایتی دینی مکاتب فکر کے علماء کرام تقسیم ملک سے پہلے بھی ہندوؤں اورمسلمانوں کی قائم

کردہ ان سیاسی جماعتوں (جیسے کانگریس اور مسلم لیگ) کی حمایت کر رہے تھے جو انگریز کی قائم کردہ (مغربی) جمہوریت کے تحت کام کر رہی تھیں اور تقسیمِ ملک کے بعد ان کی قائم کردہ دینی سیاسی جماعتوں نے بھی، سطور بالا میں ذکر کردہ جدید دینی تحریک کی طرح، اسلام اور مغرب کی کفر پر مبنی تہذیب میں توافق اور مفاہمت کے نظریہ کو قبول کر لیا اور مغربی جمہوریت کو'اسلامی جمہوریت' کہہ کر قبول کر لیا اور اس برائے نام'اسلامی جمہوریت' کے ذریعے ہی غلبۂ اسلام اور نفاذ شریعت کا خواب دیکھا۔ انہوں نے اسمبلی میں شریعت بل بھی پیش کیے اور آئین بنتے وقت اس میں اسلامی دفعات رکھنے کے لیے بھی جدوجہد کی لیکن ان سب کوششوں کا حاصل یہی ہے کہ آج ملک میں مغربی فکر و تہذیب کے اصول و اقدار غالب ہیں اور اسلامی اصول و اقدار پسپا ہو رہی ہیں اور یہ جماعتیں سیاسی میدان میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ اور اگر کسی وقت انہیں کسی صوبے میں یا مرکز میں جزواً اقتدار ملا بھی تو وہ موثر انداز میں اسلام کے لیے کام نہ کر سکیں۔ ان جماعتوں نے بھی جدید دینی تحریک کی طرح فرد اور معاشرہ کی اصلاح اور حمایت کے بغیر محض سیاسی جدوجہد سے اسلامی انقلاب لانا چاہا لیکن اس میں کامیاب نہ ہوسکیں (جیسا کہ نقل و عقل کا تقاضا تھا۔)

مسلک پرستی یا فرقہ واریت

تصورِ دین صحیح نہ ہونے ہی کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہے کہ روایتی علماء کرام اپنے مسلک اور مکتب فکر کو عین دین سمجھتے ہیں بلکہ اسے دین کی واحد صحیح تعبیر سمجھتے ہیں اور دوسرے مسالک اور مکاتب فکر کو عموماً غلط اور گمراہ کن بلکہ باطل گردانتے ہیں اور اس باطل کی بیخ کنی کو بھی تقاضائے دین سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کا جو جوش و جذبہ اور غیرت و حمیت دین کے لیے ہونی چاہیے وہ اپنے مسلک کے لیے رکھتے ہیں۔ اس سوچ نے ان کے اندر دوسرے مسالک کے لیے نفرت اور تعصب پیدا کر دیا ہے اور فرقہ واریت کی یہ فضا انہیں ان امور میں بھی اکٹھے نہیں ہونے دیتی جو ان کے درمیان متفق علیہ ہیں جیسے پاکستان میں نفاذِ شریعت۔ یاد رہے کہ ان سب مکاتبِ فکر میں تقریباً ۹۰ فیصد دین پر اتفاق موجود ہے اور اختلاف صرف چند امور میں ہے اور وہ بھی عموماً فروعات اور تفصیلات میں لیکن فرقہ واریت کا زہر انہیں اس پر غور کا موقع نہیں دیتا۔ اور فی الجملہ پاکستانی معاشرے میں دین نام ہے مسلک کا اور جو لوگ اس مسلک پرستی سے بالاتر ہو کر دینی کام کرنا چاہیں (جیسے ہم ہیں) تو انہیں نہ علماء اور ان کی دینی جماعتوں کی حمایت میسر آتی ہے اور نہ ان

کے متبعین عوام کی کیوں کہ ان علماء کرام نے فرقہ واریت اور مسلک پرستی کا یہ زہر اپنے مسلکی مالی مفادات کے لیے عوام الناس تک پھیلا دیا ہے اور یہ تقسیم اتنی گہری ہے کہ اس نے معاشرتی، مذہبی، سیاسی، سماجی ہم آہنگی کو اندر تک مجروح کیا ہوا ہے۔

اس مسلک پرستی اور فرقہ واریت کی وجہ سے ہی ہمارے ہاں مساجد، مدارس، دینی اصلاحی جماعتیں اور دینی سیاسی جماعتیں اور ادارے بلکہ حکومتی ادارے بھی، مسلکی پرستی سے متاثر ہیں۔ مطلب یہ کہ ہمارے ہاں مسجدیں اللہ کا گھر نہیں کسی نہ کسی مسلک کا مرکز ہیں۔ دینی مدارس دین کی تعلیم نہیں دیتے بلکہ اپنے اپنے مسلک کے سپاہی پیدا کرتے ہیں۔ ان کے امتحانی بورڈ یعنی وفاق بھی ہر مسلک کے اپنے الگ الگ ہیں۔ دینی اصلاحی و تبلیغی جماعتیں بھی مسلک پر مبنی ہیں۔ دینی سیاسی جماعتیں بھی ہر مسلک کی الگ الگ ہیں۔ اور انتخابات میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اس سے ان کی ہوا خیزی بھی ہوتی اور اسلام کی بھی۔ ان کے ووٹ تقسیم ہو جاتے ہیں اور وہ الیکشن ہار جاتی ہیں۔ جو آدمی دینی سیاسی جماعت کو مسلک کی بنیاد پر کھڑا کرتا ہے اسے پتا ہوتا ہے کہ دوسرے مسالک کے لوگ اسے ووٹ نہیں دیں گے لیکن اس کے باوجود وہ شکست قبول کر لیتا ہے لیکن دوسرے مسالک کو اپنے ساتھ ملانا پسند نہیں کرتا۔

دینی مدارس کے علاوہ یہ بیماری پبلک سیکٹر و پرائیویٹ سیکٹر کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی پھیل چکی ہے۔ ملک کے حکومتی ادارے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ پنجاب کے محکمہ اوقاف میں دو صوبائی خطیب ہوتے ہیں: ایک حنفی دیوبندی اور دوسرا حنفی بریلوی۔ اسلامی نظریاتی کونسل اور رویت ہلال کمیٹی میں بھی سب مسالک کو نمائندگی دی جاتی ہے۔ اسی طرح یہ بیماری وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ اپیل بنچ تک مار کرتی ہے اور وہاں بھی تعیناتیاں مسلک کو ملحوظ رکھ کر کی جاتی ہیں۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ مختلف مسالک کے علم بردار اِن جلیل القدر علماء کرام کو اس کا بھی احساس نہیں کہ ان میں مسلک پرستی کو فروغ کون دے رہا ہے؟ حالاں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں انگریزی استعمار نے حنفی علماء میں اختلافات کو ہوا دے کر حریف مسالک میں بدلا اور 'وہابیوں' کے خلاف بھی شدید پروپیگنڈا کیا۔ ورنہ سوچنے کی بات ہے کہ حنفیت تو دیوبند کے قیام سے پہلے اور امام احمد رضا مرحوم سے پہلے بھی موجود تھی اور اس پر سارے حنفی متفق تھے لہٰذا

احناف کی دیوبندیت اور بریلویت میں ایسی تقسیم جو انہیں کسی قیمت پر، کسی مقام پر، کسی میدان میں اکٹھا نہیں ہونے دیتی یہ انگریزی استعمار کی پیدا کردہ ہے۔ اسی طرح ہمارے ان علماء کرام کا اخلاص اور فراست انہیں اس پر متنبہ نہیں کرتی کہ پاکستان میں دینی قوتوں میں جو اختلافات ہیں انہیں ہوا دینے میں اور ان لوگوں کو اکٹھا نہ ہونے دینے میں مغربی ممالک اور ان کی خفیہ ایجنسیوں اور ان کے ایجنٹ مسلم حکمرانوں اور مقامی خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ ہے۔

عدم اتحاد

تصورِ دین کے اختلافات اور مسلک پرستی اور فرقہ واریت کی وجہ سے ایک بڑا نقصان جو پاکستان کی دینی قوتوں کو پہنچا ہے وہ ہے ان کا باہمی عدم اتحاد۔ فکری انتشار اور باہمی نفرت وتعصب کا نقصان یہ ہے کہ وہ ان امور میں بھی متحد ہو کر کام نہیں کرتیں جن میں انہیں کوئی اختلاف نہیں۔ ان میں سرفہرست ملک میں نفاذِ شریعت ہے۔ اس بات میں علماء کرام کے درمیان کوئی اختلاف نہیں کہ پاکستان میں شریعت نافذ ہونی چاہیے لیکن اس کے باوجود وہ اس کے لیے متحد ہو کر متفقہ اور مشترکہ جدوجہد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ کیوں تیار نہیں؟ ہمارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ اس کا جواب علماء کرام ہی سے مانگنا چاہیے کہ جب وہ اسب اس پر متحد ہیں کہ پاکستان میں شریعت نافذ ہونی چاہیے تو پھر وہ اس کے لیے متحد کیوں نہیں ہوتے؟ اور اس کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟ حقیقت یہ ہے کہ دین کے اکثر بنیادی امور میں ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان میں توحید، رسالت اور آخرت کے ماننے کے حوالے سے کوئی اختلاف نہیں۔ ان میں نماز، روزے، زکوٰۃ، حج کی فرضیت اور ان پر عمل کرنے کے حوالے سے کوئی اختلاف نہیں۔ ان میں جدید تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے میں کوئی اختلاف نہیں۔ ان میں جدید تعلیمی اداروں میں تدریس قرآن وسنت وسیرت پر کوئی اختلاف نہیں۔ ان میں فحاشی، عریانی اور بے حیائی کے خاتمے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ غرض دین کے اکثر امور میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں لیکن مسلک پرستی کی وجہ سے وہ ان پر عمل درآمد کے لیے مل کر کام کرنے کو تیار نہیں؟

اچھا! انہیں یہ بھی پتا ہے کہ اگر وہ مل کر کام کریں گے تو کامیاب ہو جائیں گے مثلاً انہوں نے ختم نبوت اور قادیانیت کے مسئلے میں مل کر تحریک چلائی تو کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح اگر وہ نفاذِ

شریعت کے مسئلے پر مل کر تحریک چلائیں تو یقیناً وہ کامیاب ہو جائیں گے لیکن اس کے باوجود وہ مل کر نفاذ شریعت کے لیے تحریک نہیں چلاتے۔اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جو بین الاقوامی اور ملکی قوتیں نہیں چاہتیں کہ پاکستان میں شریعت نافذ ہو، وہ انہیں نہ متحد ہونے دیتی ہیں اور نہ انہیں متحد ہو کر اس کے لیے تحریک چلانے دیتی ہیں۔اب یہ علماء کرام اور دینی قوتوں کے اخلاص اور فراست کا امتحان ہے کہ وہ اس چیلنج سے عہدہ برآ ہوں اور مل کر نفاذ شریعت کے لیے تحریک چلائیں اور اسے کامیاب بنائیں۔

نفاذِ شریعت کے لیے ہوم ورک نہ ہونا

دنیا میں کوئی کام بھی پلاننگ کے بغیر نہیں ہوتا۔اگر پاکستان کی دینی قوتیں چاہتی ہیں کہ وہ ملک میں شریعت نافذ کریں تو سوال یہ ہے کہ انہوں نے اس کے لیے کیا پلاننگ کی ہے؟ کیا کسی دینی سیاسی جماعت نے کوئی تھنک ٹینک، کوئی تحقیقی ادارہ اس کام کے لیے قائم کیا ہے جو اس بات پر ریسرچ کرے کہ پاکستان میں شریعت کیسے نافذ ہوگی؟ اس کی (Pre-Requist) کیا ہیں (یعنی اس پر عملدرآمد کے لیے کن پیشگی اقدامات کی ضرورت ہے؟) اس کے مقاصد کیا ہوں گے؟ اس کے مختلف مراحل کیا ہوں گے؟ ہر مرحلے کی کیا ضروریات اور تقاضے ہوں گے اور انہیں کیسے پورا کیا جائے گا؟ ہمارے علم کی حد تک اس طرح کا ہوم ورک کسی دینی سیاسی جماعت نے نہیں کیا ہوا؟ یہی وجہ ہے کہ جب دینی جماعتوں کو صوبہ سرحد میں اقتدار ملا تو وہ کوئی اچھی کارکردگی نہ دکھا سکیں کیونکہ انہوں نے پہلے سے کوئی پلاننگ نہ کر رکھی تھی کہ کیا کرنا ہے؟ اسی طرح بعض دینی سیاسی جماعتوں کو کئی دفعہ مرکز میں جزوی اقتدار ملا لیکن وہ اسلامی لحاظ سے کوئی قابلِ ذکر مثبت کردار نہ ادا کر سکیں کیونکہ نفاذِ شریعت کے لیے انہوں نے کوئی پلاننگ نہ کر رکھی تھی، کوئی حکمت عملی ان کے پاس نہ تھی۔ظاہر ہے وزارت کے مزے اور مراعات لینا تو ان کا ہدف ہرگز نہ تھا تو پھر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آج تک اقتدار میں آنے والے دینی قائدین نے نفاذِ شریعت کے لیے کیا کیا ہے؟ یا ان کی وزارتوں کی وجہ سے نفاذ شریعت کی منزل کی طرف کیا پیش رفت ہوئی ہے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہے جو افسوسناک اور مایوس کن ہے۔

پاکستان میں نفاذ شریعت کے حوالے سے علماء اور دینی قوتوں کے کردار کے بعد اب ہم اس

سے متعلق دیگر عناصر اور طبقات کا ذکر کریں گے۔

حکمران اور حکمران طبقات

پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کی ایک زور دار سیاسی تحریک کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔اس تحریک کا مرکزی اور بنیادی نکتہ 'دوقومی نظریہ' تھا یعنی مسلمان اسلام کے نام لیوا ہونے کی وجہ سے ایک منفرد نظریہ حیات، تمدن اور تہذیب رکھتے ہیں اور دوسروں سے الگ قوم ہیں لہٰذا انہیں ایک الگ آزاد خطہ اور ریاست کی ضرورت ہے جہاں وہ اپنی مرضی سے اپنے عقائد اور اپنے نظریہ حیات کے مطابق اپنی اجتماعیت وجود میں لاسکیں۔ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت نے اس تحریک کی حمایت کی چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلم لیگ کو جو یہ تحریک چلا رہی تھی، کامیابی عطا فرمائی اور پاکستان کے نام سے آزاد ملک وجود میں آ گیا۔

مسلم لیگ ایک سیاسی جماعت تھی جو ہندوستان میں انگریز کی قائم کردہ جمہوریت کا تجربہ رکھتی تھی اور اسے ہی جاری رکھنا چاہتی تھی۔حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ پاکستان کا نہ صرف سیاسی نظام بدلا جاتا بلکہ سارے شعبہ ہائے حیات کی بنیاد اسلامی اصول و اقدار پر رکھی جاتی لیکن یہ سب کچھ نہیں ہوا اور ہماری حکومتیں اسلام کی بجائے مغربی فکر و تہذیب کے مطابق نظام حیات چلانے لگ گئیں۔

پاکستانی حکمرانوں میں صرف ضیاء الحق ایسے حکمران تھے جنہوں نے اپنی عقل سمجھ کے مطابق پاکستان کے نظامِ حیات کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں متعدد اقدامات کیے۔لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کام کیسے کریں؟ نہ ان کے پاس اس مقصد سے ضروری علم تھا اور نہ ان کی تربیت اس حوالے سے ہوئی تھی اور نہ انہیں اس کے لیے صحیح مشاورت ملی۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کوئی ٹھوس اور دیرپا کام نہ کر سکے۔ان کے علاوہ آج تک جتنے حکمران پاکستان میں آئے ہیں، خواہ وہ سیاست دان ہوں یا فوج کے سربراہ، کسی کا بھی ہدف یہ نہ تھا کہ ملک میں شریعت نافذ کی جائے بلکہ سب اس کے مزاحم تھے۔ہاں! یہ ضرور ہوا کہ یہ جانتے ہوئے کہ پاکستان کے عوام محب اسلام ہیں اور علماء اور دینی قوتوں کا دباؤ اور مطالبہ بھی نفاذ شریعت کا ہوتا ہے لہٰذا ہر سیاسی جماعت اپنے انتخابی منشور میں اسلام کے حوالے سے اسلامی اقدامات کا

اعلان ضرور کرتی ہے اور اس کے نعرے ضرور لگاتی ہے لیکن ان نعروں اور وعدوں پر عمل کا ان کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، یہ محض نمائشی ہوتے ہیں۔

یہ حال صرف حکمرانوں کا نہیں (خواہ وہ سیاستدان ہوں یا فوجی) بلکہ سارے حکمران طبقوں کا ہے یعنی فوج، عدلیہ، انتظامیہ (بیوروکریسی) اور مقننہ (مرکزی وصوبائی اسمبلیاں) وغیرہ کیونکہ ان سب شعبوں کے چلانے والے افراد کی تعلیم وتربیت ابھی تک اسی انداز میں ہورہی ہے جس طرح انگریز کے استعماری عہد میں ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی ذہنیت (مائنڈ سیٹ)، ان کا طرزِ عمل اور ان کا اسلوبِ حیات آج بھی وہی ہے جو انگریزی استعمار کے زمانے میں ان کے پیشرؤں کا تھا اور وہ اسلام اور اسلامی نظامِ حیات کی بجائے مغربی فکر وتہذیب اور اس کے اداروں اور اس کے نظامِ حیات کے تحت ہی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ وہ چونکہ مسلمان ہیں (خواہ نام ہی کے ہوں) اور مسلم معاشرے میں رہتے ہیں لہٰذا وہ منہ پھاڑ کر یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم نفاذ شریعت نہیں چاہتے یا اسے نافذ نہیں ہونے اور کرنے دیں گے لیکن عملاً ان کا رویہ یہی ہے کہ وہ نہ شریعت پر عمل کرنا چاہتے ہیں اور نہ اسے ریاستی سطح پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ جب سے پاکستان بنا ہے حکومتی سطح پر یہی منافقت اور یہی دورنگی غالب ہے اور اس وقت تک غالب رہے گی جب تک اللہ کو منظور ہے یا جب تک پاکستان کی دینی قوتیں اور پاکستان کے عوام مل کر اس نظام کو ختم نہیں کردیتے۔

عامتہ المسلمین

اسلام میں ہر مسلمان محترم ہے اور اللہ کا عبد ہے۔ ہر مسلمان کا ہدف یہ ہوتا ہے (اور ہونا چاہیے) کہ وہ اللہ ہی کی عبادت کرے اور صرف اسی کی اطاعت کرے (ہر طرح کی دوسری اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تحت ہیں)۔ عام مسلمانوں کی مشاورت سے ان کے حکمران کا تقرر ہوتا ہے اور وہ حکمران بھی، عامتہ المسلمین کی طرح، اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کا مکلف ہوتا ہے۔ عامتہ المسلمین حکمرانوں کے غلام نہیں، ان کے آقا نہیں، ان کی 'رعایا' ہوتے ہیں۔ رعایا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ ان کی دیکھ بھال کریں، ان کی خدمت کریں، انہیں مشکلات سے بچائیں، انہیں اسلامی احکام پر عمل کرنے میں مدد دیں وغیرہ۔

مغربی فکروتہذیب میں عامۃ الناس خود خدا ہوتے ہیں کیونکہ ہیومنزم کی رو سے فرد/ انسان اپنا خدا خود ہے، وہ کسی خدا کا عبد نہیں ہوتا لہٰذا وہ خودمختار بلکہ مختار مطلق ہوتا ہے۔ انسان کا اسی خود مختاری کا مظہر ان کا سیاسی نظام اور جمہوریت ہے جس میں طاقت کا منبع و مرکز عوام ہوتے ہیں۔ ان خودمختار عوام کے نمائندے جس جگہ بیٹھ کر حکومت چلاتے اور قانون سازی کرتے ہیں۔ وہ ریاست کے سب اداروں سے سپریم ہوتی ہے، وہ آئین بناتی ہے جو (مسلمانوں میں قرآن وسنت کی طرح) مقدس ترین ہوتا ہے اور جس کے مطابق ریاست کا انتظام چلایا جاتا ہے۔ یہ پارلیمنٹ جو قانون چاہے بنا سکتی ہے، وہ جس چیز کو چاہے حلال یا حرام قرار دے سکتی ہے کیونکہ وہ خودمختار اور ملک کے مالک عوام کی خواہشات کی نمائندہ ہوتی ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے قطعِ نظر (بلکہ مغربی نقطۂ نظر کے بھی برعکس) آج کل مسلم ممالک میں اور خصوصاً پاکستان میں عوام/ عامۃ الناس کی حیثیت بھیڑ بکریوں جیسی ہے (عربی میں کہتے ہیں ''عوام کالانعام'' یعنی عوام کی حیثیت جانوروں جیسی ہے) جنہیں جاگیردار، سرمایہ دار اور طاقتور سیاستدان، حکمران اور فوج جدھر چاہے ہانک دیتی ہے اور جو سلوک چاہے ان سے روا رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کے مسلمان عوام کی اکثریت غریب اور ناخواندہ ہے، انہیں نہ اپنے حقوق کا پتا ہے اور نہ اپنی طاقت کا اندازہ ہے۔ انہیں حکمرانوں نے جان بوجھ کر غریب اور ناخواندہ رکھا ہوا ہے تاکہ وہ ان پر آرام سے حکومت کرتے رہیں۔ جنرل ایوب خان کے خلاف اور پھر بھٹو کی آمریت اور ظلم وستم کے خلاف ہم نے اپنی زندگی میں دو دفعہ عوام کو حکمرانوں کے خلاف اٹھتے دیکھا ہے لیکن دونوں دفعہ انہیں کچھ نہیں ملا بلکہ پہلے سے بدتر حکومت آ گئی اور صرف سیاستدانوں اور فوج نے اس عوامی تحریک سے فائدہ اٹھایا۔ عوام کے مسائل اور مشکلات آج پہلے سے سوا ہیں اور وہ سیاستدانوں اور حکمرانوں (خواہ سول ہوں یا فوجی) سے مایوس ہیں۔ ان کی زندگی کا اکثر وقت دو وقت کی روٹی مہیا کرنے کی نذر ہو جاتا ہے۔ وہ سیاسی لحاظ سے علماء اور دینی قوتوں سے بھی مایوس ہیں کہ وہ انہیں کوئی ریلیف دینے اور دلوانے میں آج تک کامیاب نہیں ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں دینی سیاسی جماعتوں کو ووٹ دینے سے کوئی دلچسپی نہیں۔

ہاں! مذہبی طور پر وہ علماء کرام کی قدر کرتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں لیکن جیسا کہ سطورِ بالا سے ظاہر ہے کہ مذہبی لوگوں نے ان کی دینی رفعت و پاکیزگی کے لیے بھی زیادہ کام نہیں

کیا۔حالت یہ ہے کہ آج پاکستان میں ایک فیصد بھی ایسے لوگ موجود نہیں جو قرآن کی عربی عبارت پڑھ کر اسے سمجھ سکیں اور پانچ سات فیصد سے زیادہ ایسے لوگ نہیں جو مسجد میں جا کر پانچ وقت کی نماز پڑھتے ہوں۔ان کے اخلاق و کردار کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔پاکستان کے مسلم عوام کی اس دینی وسیاسی حالت کی بناء پر کیسے ان سے توقع رکھی جائے کہ وہ ملک میں نفاذِ شریعت میں کوئی اہم کردار ادا کر سکیں گے۔دینی اسلامی جماعتوں اور دینی اصلاحی جماعتوں کو اس حوالے سے اپنی حکمت عملی بدلنے کی ضرورت ہے۔علماء کرام اور دینی قوتیں اگر آج بھی متحد ہو جائیں، عوام کی دینی تعلیم وتربیت کا اہتمام کریں،ان کی مشکلات حل کرنے کی تدبیر کریں تو مسلم عوام کی عمومی حمایت انہیں میسر آسکتی ہے اور عوام کو نفاذِ شریعت کے لیے متحرک کیا جا سکتا ہے لیکن فی الحال تو حالت یہ ہے کہ اردو محاورے کے مطابق نہ من تیل کے مہیا ہونے کا کوئی امکان نظر آتا ہے اور نہ رادھا کے ناچنے کا۔

بین الاقوامی طاقتوں کی کارفرمائی

اسلام میں جہاد کی دو قسمیں ہیں: دفاعی اور اقدامی۔اقدامی جہاد سے مراد اشاعت اسلام ہے۔اسلام جبراً کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا البتہ اگر کوئی حکمران اپنی رعایا کو اسلام قبول کرنے سے روکے یا اسلام کی مخالفت کے لیے ریاستی قوت استعمال کرے تو اسلام جبر کی اس قوت کو توڑنا چاہتا ہے تاکہ عوام میرٹ پر اسلام کے رد وقبول کا فیصلہ کر سکیں۔اس جہاد سے مقصود لوگوں کی ہمدردی ہے تاکہ انہیں جہنم کی آگ سے بچایا جا سکے۔یوں خلافت راشدہ نے اپنے عہد میں روم کی مسیحی سپر پاور کو شکست دی۔اس کے بچے کھچے عناصر کو سلطان محمد فاتح نے ۸۵۷ھ/ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ میں شکست دی۔ان صدیوں میں جب مسلمان عروج پر تھے تو یورپی مورخین اس عہد کو قرونِ ظلمہ کہتے ہیں اور مسیحیوں کا دور زوال قرار دیتے ہیں۔قسطنطنیہ کی شکست کے بعد سلطان محمد فاتح نے پادریوں کو بحافظت شہر سے نکل جانے دیا۔انہوں نے یورپ جا کر اپنی مظلومیت اور مسلمانوں کے مزعومہ ظلم وستم کی دہائی دی اور لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا۔مسلمانوں کے خلاف اس نفرت،تعصب اور اشتعال نے عوام وخواص کی سطح پر گہرے اثرات ڈالے اور مسلمانوں کے خلاف یورپی ممالک نے متحد ہو کر صلیبی جنگیں شروع کر دیں جن میں ایک اہم نکتہ مسلمانوں سے بیت المقدس (یروشلم) واپس لینا تھا۔

اسلام اور مسلمانوں سے اہل مغرب خصوصاً اہل یورپ کی نفرت اور تعصب کا یہ سفر جاری تھا کہ مسلمان اپنی نالائقیوں اور اسلامی اصولوں پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے روبہ زوال ہوگئے۔ اہل یورپ نے اس موقعہ کو بدلے اور انتقام کا بہترین مصرف جانا۔ انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف لڑایا۔ عثمانی خلافت کے خلاف سازشیں کیں اور مسلمانوں کی گرتی دیوار کو دھکا دے کر گرا دیا اور مسلمان ممالک پر قبضہ کرلیا۔ ۱۹۲۴ء میں اس نے اپنے لے پالک کمال اتاترک سے عثمانی خلافت کا خاتمہ کرادیا۔ اس طرح مسلم زوال پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی۔

اہل مغرب نے نہ صرف مسلم ممالک پر قبضہ کیا، انہیں کچلا، لوٹا، نچوڑا اور غلام بنالیا بلکہ انہیں ہمیشہ غلام رکھنے اور انہیں فکری شکست دینے کے لیے بھی بھرپور کارروائیاں کیں۔ اس نے ان کے نظام تعلیم وتربیت کو بدلا بلکہ سارے شعبہ ہائے حیات اور ان کے اجتماعی ڈھانچے (جیسے سیاسی نظام، معاشی نظام، قانونی وعدالتی نظام، معاشرتی نظام وغیرہ) کو توڑ کر مغربی فکر وتہذیب کی بناء پر ان کی تشکیل نو کی۔ اس طرح وہ مسلمان نسلوں کو ذہنی طور پر غلام بنانے میں کامیاب ہوگیا۔

اس صورت حال میں جب اللہ تعالیٰ نے دو عظیم جنگوں میں ان کو باہم لڑا کر کمزور کیا تو دوسری جنگ عظیم کے بعد وہ مسلم ممالک کو کسی حد تک آزادی دینے پر مجبور ہوگئے۔ اور اردو کی اس ضرب المثل کے مصداق کہ 'چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے'، اب یورپی استعمار نے چولا بدل لیا اور مسلمانوں کو فکری اور عملی غلام رکھنے کے لیے پرامن حکمتِ عملی وضع کرلی۔ انہوں نے مسلم ممالک میں اقتدار ایسے لوگوں کو منتقل کیا جو ان کی فکر کے پروردہ اور ان کی تہذیب کے رسیا تھے اور ان کے ذریعے حکمران طبقات اور اشرافیہ کا استعماری دور کا کردار جاری رکھا۔ چنانچہ اکثر مسلم ممالک میں وہ حکمرانوں کو اپنے زیر اثر لانے میں کامیاب رہے جو ان کے مفادات کے نگہبان اور ان کی پالیسیوں کو جاری رکھتے تھے (اس فرق کے ساتھ کہ اب مغرب کی قیادت برطانیہ کی بجائے امریکہ کو منتقل ہوگئی تھی)۔ یہ سلسلہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ستر اسی سال تک کامیابی سے جاری رہا اور مسلم ممالک میں مغربی فکر وتہذیب کافی حد تک نفوذ کر گئی لیکن امریکہ ویورپ کی پوری کوشش اور بھرپور سازشوں کے باوجود بعض مسلم ممالک سر اٹھانے میں کامیاب ہوگئے۔ چنانچہ امریکہ ویورپ نے اپنے حلیفوں سمیت مسلم دنیا کو تباہ کرنے اور سزا دینے کا فیصلہ کرلیا، چنانچہ حیلے بہانے سے اور اپنی جدید اور تباہ کن جنگی مشینری سے پہلے عراق کو تباہ کیا

گیا، پھر افغانستان کو اور اس کے بعد لیبیا کو۔ شام اور یمن کو اس وقت تباہ کیا جار ہا ہے اور پاکستان وایران شدید دباؤ میں ہیں اور ان کو تباہ کرنے کی مسلسل کوششیں جاری ہیں۔

جمہور مسلمان اور جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ مغربی فکر وتہذیب الحادی اور کافرانہ ہے اور اسلام کے مقابل دین اور نظریہ حیات ہے۔ اور اس تہذیب کے علم بردار امریکہ ویورپ (اور ان کے حلیف) مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ یہ کسی قیمت پر نہیں چاہتے کہ کسی مسلمان ملک میں شریعت نافذ ہو، اسلامی نظام حیات غالب آئے یا وہاں دینی قوتیں برسر اقتدار آئیں۔ چنانچہ ہر مسلمان ملک میں امریکہ ویورپی ممالک خود اور ان کی طاقتور خفیہ ایجنسیاں اس کے لیے کام کرتی رہتی ہیں۔ اور نہ صرف خود کام کرتی ہیں بلکہ ہر مسلم ملک کے حکمرانوں اور خفیہ ایجنسیوں سے بھی یہی کام لیتی ہیں کہ کسی مسلم ملک میں دینی جماعتیں برسر اقتدار نہ آئیں، کسی ملک میں اسلامی قوانین نہ بنیں اور بن جائیں تو نافذ نہ ہوسکیں اور موثر نتائج نہ دے سکیں۔ اس کے لیے بے شمار ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ دینی جماعتوں کو اندر سے توڑا جاتا ہے۔ انہیں باہم لڑایا جاتا ہے۔ لیڈروں کو رشوت دے کر خریدا جاتا ہے۔ میڈیا کو استعمال کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر کسی ملک میں ایسی قیادت برسر اقتدار آجائے جو ان کی مرضی پر نہ چلے تو اسے راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے (پاکستان میں بھٹو اور ضیاء الحق کی مثالیں موجود ہیں)۔ افغانستان کا قصور صرف اتنا تھا کہ ملا عمرؒ اسلامی شریعت نافذ کرنے پر مصر تھا اور مغرب کے نیچے لگنے اور ان کا نظامِ حیات قبول کرنے اور اپنے ملک میں نافذ کرنے پر تیار نہ تھا چنانچہ افغانستان کا تورا بورا بنا دیا گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر پاکستان میں شریعت نافذ نہیں ہوسکی تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے (اگر چہ بہت سارے قصور ہمارے اپنے ہی ہیں) کہ امریکہ ویورپ نہیں چاہتے کہ پاکستان میں شریعت نافذ ہو اور وہ اس کے لیے وہ سارے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں جن کا ہم نے سطورِ بالا میں ذکر کیا ہے۔

یہ خلاصہ ہے ان دلائل کا کہ پاکستان میں آج تک شریعت کیوں نافذ نہیں ہوسکی؟ اب ہم اس بات پر اپنی سوچ قارئین کے سامنے رکھیں گے کہ اس تجزیے کی روشنی میں پاکستان میں مستقبل میں نفاذ شریعت کا صحیح لائحہ عمل کیا ہوسکتا ہے؟ **وباللہ التوفیق**۔

تعلیم و تربیت محمد آصف خان[1]

لبرل انتہا پسندی اور ہمارا نصابِ تعلیم و نصابی کتب

دنیا بھر میں ہر ملک کا تعلیمی نصاب اس کے قومی مقاصد کے تابع ہوتا ہے۔ معاشی، معاشرتی ضروریات، سائنسی اور تکنیکی ترقی کے لیے نصاب کو اپ ڈیٹ کیا جاتا ہے۔ ہمیں بحیثیت ترقی پذیر قوم دنیا کے ساتھ ترقی کی دوڑ میں برابر دوڑنا ہے مگر تعلیم اور نصاب کی سادہ سی تعریف کو سامنے رکھتے ہوئے' اپنی اقدار اور روایات کو ساتھ لیتے ہوئے ترقی کرنی ہے' ورنہ قومیں مٹ جایا کرتی ہیں۔ ہماری اقدار اسلامی اور مشرقی ہیں۔ ہمیں ترقی ضرور کرنی ہے کہ دنیا والوں سے پیچھے نہ رہ جائیں لیکن اپنی اقدار اور روایات کے تابع رہ کر، بس اتنی سی بات ہے۔ مگر نصاب تعلیم میں اصلاحات کے حوالے سے گزشتہ چند دہائیوں سے کچھ مخصوص لوگ لبرل انتہا پسند لابی اور ڈونرز کے زیر اثر ہماری اسلامی اور مشرقی اقدار پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں بلکہ بہت حد تک اپنے مذموم مقاصد حاصل بھی کر چکے ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول میں دن رات کوشاں ہے۔ جیسے آج (16 مئی 2022) کے روزنامہ مشرق پشاور کے ایڈیٹوریل کے مطابق 'نصاب تعلیم پر نظر ثانی کا عندیہ' صوبائی کابینہ کے حالیہ اجلاس اور فیصلہ کی روشنی میں صوبائی ڈائریکٹوریٹ آف کریکولم اینڈ ٹیچر ایجوکیشن (DCTE) ایبٹ آباد، جماعت چہارم تا جماعت ہشتم آٹھ مضامین پر مشتمل نصاب کو نافذ کرنے جا رہا ہے جس میں اسلامیات کا مضمون بطور لازمی مضمون نہیں ہوگا جبکہ کمپیوٹر کے مضمون کا آغاز جماعت چہارم سے ہوگا۔ کمپیوٹر وقت کی اہم ضرورت ہے اس سے انکار نہیں مگر..... اس ضمن میں تمام ٹیکسٹ بک بورڈز اور سرکاری و نجی اداروں کے سربراہان کو مراسلے ارسال کر دیئے گئے ہیں۔

مشاہدہ اور تجربہ شاہد ہے کہ اس سے قبل ان اغیار کے نمائندوں نے اسلامی تعلیمات کو زبان دانی کے مضامین (اُردو، انگریزی اور عربی) سے نکال باہر کیا۔ بیانیہ یہ رکھا گیا کہ زبان دانی میں اسلامی تعلیمات، اسلامی اقدار اور اسلاف کے کارناموں کا کیا کام ہے یہ تو اسلامیات کے مضمون

[1] روزنامہ 'ندائے خلق' ہری پور میں کالم

میں شامل ہونے چاہئیں۔ زبان سیکھنے سکھانے میں اسلامی اور مشرقی اقدار اور اسلامی ہیروز کا کیا لینا دینا۔ حتیٰ کہ اس لبرل لابی نے ختم نبوت سے متعلق حدیث مبارک (جماعت اول کی اُردو اور اسلامیات جماعت چہارم) ’کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا‘ کا نصف حصہ کاٹ دیا۔ اس پر دس سال کے عرصہ تک درددل رکھنے والے مسلمان اپنی آواز بلند کرتے رہے۔ ہر ہر فورم پر بات کی گئی کہ آدھی حدیث مبارک اور مسلمانوں کا قطعی عقیدہ کہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا؛ میں سے ’’ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا‘‘۔ یہ عقیدہ کاٹ دیا گیا یا آدھی حدیث مبارک کاٹ دی گئی ہے، مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ عدالت عالیہ پشاور ہائی کورٹ سرکٹ بینچ ایبٹ آباد نے فروری 2021ء میں فیصلہ صادر فرمایا، اپنی اقدار اور دین اسلام کے سب سے پکے اور سچے عوام کے صوبائی ادارہ (DCTE-KP ایبٹ آباد) نے عدالت کے احکامات کی تکمیل کرتے ہوئے مجبوراً اس حدیث مبارک کو مکمل کرتے ہوئے اسے بحال کیا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لبرل انتہا پسند لابی کتنی مضبوط پنجے گاڑے ہوئے ہے۔ یہاں سوال تو بنتا ہے کہ آیا ان تعلیمی ڈائریکٹوریٹس اور ٹیکسٹ بک بورڈ میں مسلمان ہی بیٹھے ہوئے ہیں تو ایسی گستاخی کیوں ہوئی؟ ہمارے بنیادی عقیدہ پر ڈاکہ کیوں ڈالا گیا؟ بارہ سال کی کوششوں کے بعد آئین پاکستان کے مطابق ہم اپنا بنیادی عقیدہ، عقیدہ ختم نبوت عدالت سے بحال کروا سکے۔ اس گھناونے اور قبیح فعل کا ذمہ دار کون ہے؟

علاوہ ازیں ایک اور چال ملاحظہ ہو کہ عربی کی درسی کتب کو پہلے سے بہت زیادہ مشکل بنا دیا گیا ہے یعنی عربی کے نصاب کو فنکشنل عربی سے یک دم تبدیل کر کے لٹریری عربی پر بلا کسی تعلیمی تحقیق اور سفارشات کے منتقل کر دیا گیا۔ خیر، یہ بلا وجہ تو نہیں ان بے چارے مسلمانوں نے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے کیا ہے۔ عربی کے اساتذہ کرام سے پیشگی معذرت کہ ہمارے اکثر اساتذہ کرام کے بس کی بات ہی نہیں کہ اس لٹریری عربی کو کما حقہ پڑھا اور سکھا پائیں۔ ہاں جو درس نظامی کے فارغ اور فاضل اس لٹریری عربی کو پڑھا سکتے ہیں وہ یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ لٹریری عربی بچے کے لیول اور ان کی استعداد سے بالاتر ہے۔ یوں عربی کی میٹھی اور آسان زبان کو ٹیڑھی کھیر بنا دیا گیا اور اس کے بعد ظلم عظیم یہ کیا گیا کہ عربی کے مضمون کو آرٹ اینڈ ماڈل ڈرائنگ

کے ساتھ آپشنل کر دیا۔نتیجہ یہ نکلا کہ بچے، اساتذہ اور سربراہان نے اس مشکل لٹریری عربی سے جان چھڑانے میں بہتری سمجھی۔ اس طرح غیر محسوس طور پر ہم قرآن عظیم کی زبان سے دور ہو گئے۔ اس کا نتیجہ مکار منصوبہ سازوں کی منشا کے عین مطابق نکلا۔ بچے، اساتذہ اور سربراہان، آرٹ اینڈ ماڈل ڈرائنگ کو عربی کے متبادل کے طور اپنا رہے ہیں بلکہ اکثر اپنا چکے ہیں۔ایسا کرنا غیر منطقی ہے۔آرٹ اینڈ ماڈل ڈرائنگ کا عربی جیسی مقدس زبان سے کیا مقابلہ، واسطہ اور ربط بنتا ہے؟ البتہ ایک بات یہ ہے کہ ویسے بھی ہمارا نظامِ تعلیم، امتحان پاس کرنا اور مارکس (نمبر) زیادہ سے زیادہ لینا اور سالانہ نتیجہ بہتر دکھانے پر مبنی ہے۔

یہ خبر یقیناً حیران کن ہے کہ بچوں کے لیے چہارم سے ہشتم تک اسلامیات کا مضمون لازمی نہیں ہوگا۔اس میں ایک بات واضح ہے کہ لوگ غیر لازمی سمجھ کر اس کو کم اہمیت دیں گے۔لگتا ہے اس میدان میں ہارنا اس قوم کا مقدر بن چکا ہے۔ یہ لبرل انتہا پسندی کی فتح ہے۔ یہ لوگ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو رہے ہیں اور ساتھ ہمیں اسلامی رجعت پسند بھی کہہ جاتے ہیں۔اس طرح کی تبدیلی سے آئندہ نسلیں ان کی مرضی کی ہوں گی اور ان کو اپنا ہیرو مانیں گی۔اپنے اسلاف سے ناواقف ہوں گی۔اغیار ویسے تو ہماری نام نہاد تعلیمی ترقی کے لیے ڈونیشن (عطیات) اور قرضے فراہم نہیں کرتے۔ زہے قسمت ہمارے اکثر احباب 'ماہرین تعلیم' ان کے دجل، دھوکہ، فریب، مکاری کے بیانیہ کی پریزینٹیشنز میں پھنس کر ان کے حق میں دلیلیں دے دے کر 'ہلکان' ہوئے جا رہے ہیں۔ ہماری ناسمجھی، بھولا پن اور لالچ سے مکار لبرل ہم سے یہ نظریاتی جنگ جیتتے چلے جا رہے ہیں۔ہم ہیں کہ اغیار کی جیت اور اپنی ہار تک ہر میدان میں ان سے تعاون جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ہمارے قومی اداروں، ماہرین تعلیم، سیاسی لیڈرز اور مذہبی رہنماؤں کو جاگنا ہوگا ورنہ نظریاتی میدان میں ہار جانے کے بعد پیچھے کچھ نہیں بچے گا۔ کہتے ہیں مایوسی گناہ ہے اس لیے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ پاک! دین اسلام کی حفاظت کا ذمہ تو نے لے رکھا ہے اس لیے ہمارا حامی و ناصر ہو اور تمام سٹیک ہولڈرز کے ضمیروں کو جگا۔ آمین ثم آمین۔ یارب العالمین۔

تعلیم و تربیت　　رضی الدین سید[1]

اسرائیل کے تعلیمی نصاب کی ایک جھلک

نئے عالمی نظام اور امریکی ایجنڈے کے تحت پورے عالمِ اسلام میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً دوسری بڑی منفی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اسکولوں، کالجوں اور جامعات کے تعلیمی نصابوں کو تبدیل کرنے اور انہیں لبرل بنانے کا کام بھی زور شور کے ساتھ جاری ہے۔ دلیل یہ دی جا رہی ہے کہ تمام انسان برابر ہیں، لہٰذا بنیاد پرستی پھیلانے اور دوسرے مذاہب کے خلاف تعصبات کو جنم دینے والے مضامین کو درسی کتابوں سے نکال دینا چاہیے۔ یاد رہے کہ معروف فری میسنری تنظیم کا نعرہ بھی یہی ہے: ''مذہب انسانیت ہی فی الاصل مذہب محبت ہے۔''

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سالوں میں ہمارے قومی نصاب سے سلطان صلاح الدین ایوبیؒ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں مضامین اور بعض حمدیہ نظمیں اور نعتیں بھی خارج از نصاب کردی گئی تھیں۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے دور میں یہودیوں کے خلاف ہونے والی جنگ خیبر اور بھارت کی جانب سے مسلط کردہ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کو بھی درسی کتابوں سے خارج کیا جا چکا ہے۔ ان معاملات پر پورے پاکستان میں بڑا اوویلا مچا تھا اور ایک ہمہ گیر تحریک بھی چلی تھی، لیکن جن صہیونی منصوبوں کو دنیا بھر میں نافذ العمل ہونا ہوتا ہے، ان کے خلاف کسی بھی قسم کا احتجاج ہمارے ہاں بے معنی سمجھا جاتا ہے۔

ایک طرف ہمارے حکمرانوں کی ذہنی مرعوبیت کا درج بالا نمونہ ہے اور دوسری طرف خود صہیونیوں کا اپنا طرزِ عمل ہے جو ہر معاملے میں یکسو ہیں اور جنہیں اپنے ہاں کسی قسم کی تبدیلی گوارا نہیں ہے۔ یہاں ایک جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ خود اسرائیل میں تعلیمی اداروں میں نصاب کی کیا حالت ہے، اور وہاں طلبہ کو کیا پڑھایا اور سکھایا جا رہا ہے!

امریکہ میں مقیم ایک عرب عیسائی اسٹیون سیلیٹا (Steven Saliata) نے اپنی کتاب *Anti-Arab Racism in the USA* میں اسرائیلی تعلیمی نصاب کے بارے میں کافی کچھ

[1] نیشنل اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ، کراچی

تفصیل سے بتایا ہے۔تل ابیب یونیورسٹی نے اپنے طلبہ کے لیے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ ''یہودی ایک منصفانہ انسانی معاشرہ تشکیل دینے میں مصروف ہیں''۔اسرائیلی کتابوں میں یہودیوں کو بہادر، محنت کش اور ملک کی ترقی میں مددگار کے طور پر پیش کیا جاتا ہے،لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ عرب ان تمام خصوصیات سے عاری ہیں۔ان کتابوں میں عربوں کو ایک ایسی قوم ظاہر کیا گیا ہے جو کمتر، غیر مہذب، سست الوجود اور بے حس ہے۔ان کے مطابق عرب قاتل ہیں، وہ جلاؤ گھیراؤ کرتے ہیں اور آسانی سے مشتعل ہوجاتے ہیں، یہ منتقم مزاج، ذہنی طور پر بیمار اور ہنگامہ آرائی کرنے والے لوگ ہیں۔

اگرچہ اسرائیلی نصابوں میں حالات کے تحت بعض اصلاحات بھی کی جارہی ہیں لیکن ان کا تعلق فلسطین اور اس کے باشندوں کے ساتھ نہیں ہے۔ایک سترہ سالہ اسرائیلی طالب علم نے بتایا کہ اس کی کتابیں اسے بتاتی ہیں کہ ہر وہ کام جو یہودی کرتے ہیں، عمدہ اور قانونی ہوتے ہیں جبکہ عربوں کے تمام فیصلے غلطی سے بھرے ہوتے ہیں۔اور یہ کہ عرب ان یہودیوں کو فلسطین سے نکالنے کے ہمیشہ درپے رہتے ہیں۔تعلیمی کتابوں میں اس طرح کے اسباق سمو کر وہاں کی حکومت ابتدا ہی سے یہودی طلبہ میں عربوں اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کے بیج بونے کی کوشش کرتی آرہی ہے۔

حیفہ کے ایک اسکول کی چھٹی جماعت کے ستّر فیصد یہودی طلبہ نے بتایا کہ عرب باشندے قاتل، اغوا کنندہ، جرائم پیشہ اور دہشت گرد ہوتے ہیں۔اسی اسکول کے اسّی فیصد طلبہ نے بتایا کہ عرب لوگ گندے ہیں اور ان کے چہرے دہشت ناک ہیں۔نوے فیصد طلبہ نے نے اظہار ائے کرتے ہوئے کہا کہ اسرائیل پر فلسطینی عربوں کا کوئی حق نہیں ہے۔

۱۹۶۷ء سے اب تک جو کتابیں اسرائیل میں شائع ہوتی چلی آرہی ہیں، ایک امریکی مصنف وایڈیٹر ''کوہن'' کے مطابق ان میں سے ۵۲۰ کتابوں میں فلسطینیوں کے بارے میں توہین آمیز اور منفی تبصرے پائے جاتے ہیں۔عربوں کو تشدد پسند، برائی کا سرچشمہ، جھوٹے، لالچی، منافق اور غدار قرار دیا گیا ہے۔رسوا کرنے کی خاطر عربوں کے لیے یہ الفاظ بھی نصابی کتابوں میں بار بار استعمال کیے گئے ہیں: قاتل:۲۱بار، سانپ:۶بار، منحوس جانور:۱۷بار، خون کے پیاسے:۲۱بار، بھوتوں اور جنوں پر یقین رکھنے والے:۹بار، اونٹ کے کوہان:۲بار۔

عربوں کے بارے میں یہ خرافات عبرانی ادب وتاریخ کا ایک بڑا حصہ ہیں۔ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام اوران کی اولاد کے لیے ابتدا ہی سے دشمنی والا رویہ رکھتے ہیں تا کہ یہودی طلبہ عربوں کے ساتھ ''معاملہ'' کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اسرائیلی مصنفین خود بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں۔

سابق اسرائیلی صدر موشے کٹساو (Katsav) نے کہا تھا کہ ہمارے اور دشمنوں کے درمیان ایک بڑا خلا ہے۔ یہ خلا محض صلاحیتوں کے لحاظ سے نہیں بلکہ اخلاق، تمدن، انسانی جانوں کی حرمت اور ضمیر کے لحاظ سے بھی ہے۔ فلسطینی وہ لوگ ہیں جو ہمارے برّاعظم اور ہماری دنیا سے تعلق ہی نہیں رکھتے۔ ان کا تعلق ایک دوسری کہکشاں سے ہے۔

اسرائیلی تعلیمی اداروں کے مختلف درجات میں یہودیوں پر ہٹلر کے مظالم کا مبالغہ آمیز قصہ ''ہولوکاسٹ'' کے نام سے پڑھایا جانا بھی لازمی ہے تا کہ آنے والی نسلیں اپنے باپ دادا کی قربانیوں اور یہودی قوم کے دنیا بھر میں مظلوم ہونے کی حالت سے واقف ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ ظلم وستم کے تفصیلی اور بار بار کے مطالعے سے ان کے اندر انتقام کا شدید ردعمل پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہودی شریعت کے مطابق دنیا بھر میں پائے جانے والے تمام غیر یہودی بشمول عیسائی اور مسلمان ''گوئم'' اور ''انسان نما حیوان'' (Gentiles) ہیں۔ لہٰذا اسی بنیاد پر ان کی ہر سطح کی درسی کتابوں میں یہودی طلبہ کو پڑھایا جاتا ہے کہ وہ اپنے علاوہ باقی تمام قوموں کو گوئم، رذیل، اور چوپائے سمجھیں۔ افسوس کہ آج کوئی اسرائیل سے یہ نہیں کہتا کہ وہ بھی اپنے نصاب سے انتقامی ردعمل کو جنم دینے والے ہولوکاسٹ اور گوئم والے اسباق خارج کر دے۔

یہودی مصنفین اسرائیل شہاک اور نورٹن میزنسکی اپنی کتاب *Jewish Fundamentalism in Israel* (''اسرائیل میں بنیاد پرستی'' ترجمہ: محمد احسن بٹ) میں لکھتے ہیں کہ اسرائیل کے تعلیمی اداروں میں طلبہ کو یہودیوں کی بنیادی مذہبی کتاب ''تالمود'' کا مطالعہ ضرور کروایا جاتا ہے۔ طلبہ کو بتایا جاتا ہے کہ عبادت کرنے، خیرات دینے یا دوسرے نیک کام کرنے کی بجائے تالمود کا مطالعہ ان کے لیے جنت میں داخلے کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ مزید یہ کہ جو طلبہ تالمود کے مطالعے میں منہمک ہوتے ہیں وہ خود اپنے، اپنے خاندان، اپنے مالی معاونین اور کسی حد تک دوسرے یہودیوں کے لیے بھی جنت میں داخلے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

یہی مصنفین لکھتے ہیں کہ ریاست اسرائیل کے قیام کے چند سال بعد ہی اسکولوں کی ریاضی کی کتابوں سے جمع کا نشان+ختم کر کے اس کی جگہ الٹے T کا نشان یہ کہتے ہوئے لگایا گیا تھا کہ جمع کا نشان یہودی بچوں کو مذہبی اعتبار سے بگاڑ سکتا ہے۔ چنانچہ یہی نشان وہاں آج تک جاری ہے۔ اسی ایک مثال سے یہود کی بنیاد پرستی کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہودی مذہب پر معروف ربیوں (ابراہام جے وٹی اور راشیل جے وٹی) کی لکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب ’’ایکسپلورنگ جوئیش ٹریڈیشن‘‘ میں بتایا گیا ہے کہ ’’یہودی اساتذہ اپنے طلبہ کو یہ ذہن نشین کراتے ہیں کہ جیسے جیسے وہ بوڑھے ہوتے جائیں گے انہیں اندازہ ہوگا کہ تورات کے ہر حرف کے پیچھے کتنے آنسو اور مشکلات پوشیدہ ہیں‘‘۔ اس طرح کی ایک نظم کا نمونہ یہ ہے:

’’پڑھو الف بے۔ جو میں کہہ رہا ہوں ’بچو‘ اسے دھیان سے سنو! جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو خود سمجھ جاؤ گے کہ ہر حرف کے اندر کتنے آنسو اور کتنے بین پوشیدہ ہیں!‘‘

ان الفاظ سے شاعر دراصل طلبہ کو یہ سمجھانا چاہ رہا ہے کہ موجودہ تورات کو تم تک پہنچانے میں ہمارے آباء واجداد کو کس قدر دکھوں اور اذیتوں سے گزرنا پڑا ہے۔

اس وقت امریکہ اور اسرائیل میں اَن گنت اسکول اور کالج ایسے ہیں جن میں مرد وخواتین کو تورات اور جدید علوم، دونوں کا عالم بنائے جانے کے کورس کرائے جاتے ہیں۔ ایک بڑا ربی الزرا، ایسی تعلیم کے بارے میں یہ اصول طے کرتا ہے کہ: ’’اگر تورات نہیں تو دنیا کا کوئی پیشہ نہیں۔ اگر آٹا نہیں ہے تو تورات نہیں، اور اگر تورات نہیں تو آٹا بھی نہیں۔‘‘ نظم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے تمام کاروباروں اور پیشوں کو صرف خدا کی ہدایت کے مطابق ہی چلانا چاہیے جس کے لیے تورات کے گہرے علم کی ضرورت ہے۔ اس طرح یہودی ربی طلبہ کو مذہبی بنیاد پرستی اپنے ذہنوں میں مستحکم کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

تورات کی تشریح کرتے ہوئے یہودی قوانین کی کتاب ’’تالمود‘‘ نے انسانی زندگی کے مختلف ادوار کا ایک نظام الاوقات پہلے ہی سے طے کر دیا ہے۔ تالمود کہتی ہے:

’’پانچ سال کی عمر سے بائبل (تورات اور زبور) کو پڑھنا شروع کرو۔ تیرہ سال کی عمر میں مذہبی فرائض کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑے ہو۔ پندرہ سال کی عمر سے تالمود کا مطالعہ کرنے

لگو۔بیس سال کی عمر سے رزق کی تلاش کرنے نکل کھڑے ہو۔''(کتاب ''تالمود بے نقاب ہوتی ہے''ترجمہ راقم، باب 5 Avot:21)

یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اس طرح کا نصاب پڑھائے جانے سے یہودی طلبہ کے اندر سوائے اس بنیاد پرستی کے، جسے اسلامی ممالک کے نصاب سے خارج کرنے کے لیے صہیونی اور امریکی مل کر احکام جاری کر رہے ہیں، دوسری اور کیا صفت پیدا ہوگی؟عالمی طور پر نصاب میں تبدیلی کی جو مہم صیہونیوں نے ڈیڑھ سو سال پہلے شروع کی تھی، اسے سب سے پہلے ایک امریکی صنعتکار اور فورڈ کار کے بانی ہنری فورڈ اول نے محسوس کیا تھا۔اپنی کتاب ''دی انٹرنیشنل جیو''(اردو ترجمہ ''عالمی یہودی فتنہ گر'' از میاں عبدالرشید، صفہ پبلشرز لاہور) میں اس نے تفصیل سے لکھا ہے کہ:

''ہماری اولادوں کو ان کے آباء اجداد کے ورثے سے محروم کیا جا رہا ہے۔ جوانی کے ابتدائی ایام میں جب کہ لڑکے آزادی فکر سے نئے نئے روشناس ہوتے ہیں، یہودی انہیں اپنے نرغے میں لے کر ان کے ذہنوں میں ایسے خیالات ٹھونس دیتے ہیں جن کے خطرناک نتائج کو ہماری اولاد اس وقت محسوس نہیں کر سکتی.... پروفیسروں اور طلبہ کو ساتھ ملا کر یہودی اپنے کام کو معزز بنا لیتے ہیں۔ یہ لوگ آرٹ، سائنس، مذہب، معاشیات، اور سماجیات غرضیکہ ہر مضمون میں اپنے نظریات داخل کر دیتے ہیں۔ یہ یہودی طریقِ کار اب پوری طرح ظاہر ہو چکا ہے۔یعنی پہلے طلبہ کو سیکولر بناؤ۔ دوسرے الفاظ میں بچے کو یہ تعلیم نہ دو کہ اس کی تہذیب وتمدن کا تعلق ایک قدیم مذہب کے گہرے اصولوں سے ہے۔یہی ہے وہ لبرل ازم، جس کا یہودی اتنا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں!''
(باب: یہودی اثرات کے مختلف پہلو)

عالمی طور پر نصاب میں تبدیلی کی یہ بات ہمارے سامنے اور زیادہ واضح ہو کر تب سامنے آتی ہے جب ہم صہیونیوں کے بڑوں کی مرتب کردہ قدیم دستاویز ''پروٹوکولز آف دی ایلڈرز آف زائینس'' کا مطالعہ کرتے ہیں۔اس میں انہوں نے عیسائی اور مسلم تعلیمی اداروں کے بارے میں اپنے نظریات کو صاف طور پر پیش کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

''جب ہماری حکومت قائم ہوگی تو سب سے پہلے ہم یونیورسٹیوں کی تعلیم کی ازسرنو تنظیم

کریں گے۔اس مقصد کے لیے ایک خفیہ پروگرام کے تحت یونیورسٹیوں کے افسروں اور پروفیسروں کو نئے سرے سے تیار کیا جائے گا۔نصاب تعلیم سے ایسے تمام مضامین خارج کر دیئے جائیں گے جو ہمارے لیے مشکلات پیدا کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ غیر یہودی عوام کو ایک ایسا فرماں بردار وحشی جانور بنا دیا جائے جو خود سوچنے سمجھنے سے عاری ہو۔''(دستاویز ۱۶)

یہی وہ رہنما خطوط ہیں جن کی بنیاد پر صہیونیوں نے پہلے تو عیسائی تعلیمی اداروں پر شب خون مارا، کیونکہ تب وہ ان کے بدترین دشمن تھے،اوراب وہ مسلم تعلیمی اداروں پر حملے کرر ہے ہیں۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ سب کچھ عیاں ہونے اوراس کے خلاف پرزور احتجاج کے باوجود عقل وخرد سے عاری ہمارے حکمران تعلیمی نصاب میں مسلسل منفی تبدیلیاں کیے جارہے ہیں۔

ہنری فورڈ سوال کرتا ہے کہ اب اس کا علاج کیا ہوسکتا ہے، پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ:

''علاج بالکل آسان ہے۔طلبہ کو بتایا جائے کہ تمام افکار کی پشت پر وہ یہودی ہیں جو ہمیں اپنے ماضی سے کاٹ کر مستقبل کے لیے مفلوج کرنا چاہتے ہیں۔انہیں بتایا جائے کہ وہ ان لوگوں کی اولاد ہیں جو یورپ سے تہذیب وتمدن لے کر آئے ہیں۔اب یہ یہودی ہمارے اندر آ گھسے ہیں جن کی کوئی تہذیب ہے نہ مذہب۔نہ انہوں نے ماضی میں کوئی کارنامہ انجام دیا ہے اور نہ مستقبل کے بارے میں ان کے عزائم اعلیٰ ہیں۔''(ص: ۱۴)

ایک اور مغربی مصنف ولیم گائی کار اپنی معروف تصنیف *Pawns in the Game* میں لکھتا ہے کہ ''ان کی قوت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے گماشتے اپنی صلاحیتوں کے باعث ہمارے تعلیمی اداروں میں اپنے ایسے واقعات بھی پڑھانے میں کامیاب ہوجاتے ہیں جو کبھی رونما ہی نہیں ہوئے۔''

شہاب نامہ

اس ضمن میں ایک اور چشم کشا حقیقت معروف سابق بیوروکریٹ قدرت اللہ شہاب کے 'شہاب نامہ' میں پیش کی گئی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

دو فلسطینی مہاجرین کے بچوں کے لیے یونیسکو نے اپنے خرچ پر یروشلم، دریائے اردن کے مغربی کنارے اور غزہ کی پٹی میں بہت سے اسکول کھول رکھے تھے۔ان اسکولوں میں تربیت یافتہ مسلمان اساتذہ بھی یونیسکو کی منظوری سے تعینات ہوتے تھے اور ان میں جو درسی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں وہ بھی یونیسکو کی جانب سے منظور شدہ ہوتی تھیں۔ جب یروشلم سمیت ان علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کرلیا تو رفتہ رفتہ یہ خبریں آنے لگیں کہ اسرائیلی حکومت نے ان اسکولوں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ یونیسکو کے متعین کردہ مسلمان اساتذہ کو زبردستی گھر بٹھا دیا گیا ہے۔ان کو تنخواہ تو باقاعدہ ملتی ہے لیکن کسی اسکول کے قریب تک آنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اگر کوئی استاد کسی جگہ حرف شکایت زبان پر لاتا ہے تو وہ اپنے بال بچوں سمیت ناقابل بیان مظالم اور تشدد کی زد میں آجاتا ہے۔ان مسلمان اساتذہ کی جگہ ہر اسکول میں اب کٹر یہودی سٹاف فلسطینی مہاجر بچوں کو پڑھانے پر مامور ہے۔اس کے علاوہ ہر اسکول سے یونیسکو کی منظور شدہ درسی کتابیں بھی نصاب سے خارج کردی گئی ہیں اور ان کی جگہ اب ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جن میں اسلام، سیرت مبارکہ اور عرب تاریخ وثقافت کے خلاف انتہائی گمراہ کن ،غلیظ اور شرمناک پروپیگنڈہ ہوتا ہے۔

ایگزیکٹو بورڈ کے ہر اجلاس میں عرب ممالک کے نمائندے اسرائیل کی ان مذموم حرکات کا کچا چٹھا کھولتے تھے اور اپنے ثبوت میں ان کتابوں کے نمونے بھی پیش کرتے تھے جو اس نے یونیسکو کے قائم کردہ اسکولوں میں زبردستی رائج کی ہوتی تھیں۔صحیح حالات کا جائزہ لینے کی غرض سے دوبار ایک معائنہ ٹیم اسرائیل گئی لیکن دونوں بار ہمیں یہ رپورٹ ملی کہ عربوں کے الزامات کی تصدیق میں مقامی طور پر کوئی ثبوت نہیں مل سکا ہے۔اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ یہ ٹیمیں اسرائیلی حکومت کے ساتھ پہلے سے اپنا پروگرام طے کر کے وہاں جاتی تھیں اور معائنہ کے روز اسرائیلی حکام متعلقہ اسکولوں میں یونیسکو کے منظور شدہ اساتذہ اور کتابوں کی نمائش کا ڈرامہ رچا دیتے تھے۔

ایگزیکٹو بورڈ میں عرب نمائندوں کے ساتھ میرے بڑے گہرے ذاتی تعلقات تھے۔ہم لوگ آپس میں مل جل کر اکثر ایسی تدبیریں سوچا کرتے تھے جن سے اسرائیل کی اس صریح دھاندلی اور اسلام دشمنی کا بھانڈا پھوڑا جائے۔کافی سوچ بچار کے بعد سب کی یہی متفقہ رائے ہوئی کہ کسی قابل اعتماد شخص کو خفیہ مشن پر اسرائیل بھیجا جائے اور وہ وہاں سے اسرائیل کے خلاف

عائدہ کردہ الزامات کا ایسا ثبوت فراہم کرے جو نا قابل تردید ہو۔کئی ہفتوں کی چھان بین اور بحث مباحثہ کے بعد انجام کار قرعہ فال میرے نام نکلا۔ میں نے بھی اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کرلیا۔ میرے دل میں ایک لگن یہ بھی تھی کہ شاید اسی بہانے میرے ہاتھوں ہزاروں فلسطینی بچوں کی کوئی خدمت ہوجائے جو اسرائیل کے قبضۂ اختیار میں آکر ایسی کتابیں پڑھنے پر مجبور تھے جن میں دین اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ پر انتہائی رکیک، بے بنیاد اور گمراہ کن حملے کیے گئے تھے۔ چنانچہ میرا رابطہ ایک خفیہ تنظیم سے قائم ہوگیا۔ چند ہفتے مجھے پیرس، قاہرہ اور بیروت میں زیر تربیت رکھا گیا۔اس کے بعد ایک جعلی ایرانی پاسپورٹ پر مجھے دس روز کے لیے اسرائیل بھیجنے کا پروگرام طے ہوگیا۔اس زمانے میں سابق شاہ ایران کی حکومت نے اسرائیل کو تسلیم کیا ہوا تھا۔

تل ابیب کے ہوائی اڈے پر کسٹم والوں سے فارغ ہوکر جب میں اپنا سامان لیے باہر نکلا تو اسرائیلی ٹورسٹ کارپوریشن کے ایک خوش لباس نوجوان نے لپک کے مجھے خوش آمدید کہا۔گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے دبی زبان سے وہ شناختی الفاظ بھی ادا کیے جن کے متعلق مجھے پیرس میں آگاہ کردیا گیا تھا۔ جواباً میں نے بھی اپنے مقررکردہ شناختی الفاظ دہرائے۔اس کے بعد ''مصطفیٰ'' نے اگلے دس روز کے لیے میرا مکمل چارج سنبھال لیا۔

مصطفیٰ اس نوجوان کا کوڈ نام تھا۔چھبیس ستائیس برس کا یہ پڑھا لکھا فلسطینی جوان کئی سال سے جان کی بازی لگا کر اسرائیل میں آزادئ وطن کی خاطر طرح طرح کے خفیہ فرائض انجام دے رہا تھا۔اسی کے زیر اہتمام میں یونیسکو کے قائم کردہ بہت سے اسکولوں میں گیا اور ۱۴۳ شرانگیز کتابوں کے نسخے حاصل کیے جو اسرائیلیوں نے یونیسکو کے منظورشدہ نصاب کی جگہ وہاں پر زبردستی رائج کررکھے تھے۔ان کتابوں پر میں نے ہیڈ ماسٹروں اور دیگر کئی اساتذہ کے آٹو گراف بھی لیے۔ یہ وہ یہودی ہیڈ ماسٹر اور اساتذہ تھے جنہیں یونیسکو کو دھوکہ دے کر مسلمان اساتذہ کی جگہ تعینات کیا گیا تھا۔کئی جگہ میں نے ان کی بہت سی خفیہ تصویریں بھی اتاریں۔ایک دو اسکولوں میں وہاں کے یہودی اسٹاف کے ساتھ میرا گروپ فوٹو بھی کھینچا گیا۔ایک اسکول میں ایک فلسطینی بچے کو انتہائی بے دردی کے ساتھ نہایت کڑی اور ذلت آمیز سزا مل رہی تھی۔اس کا قصور صرف یہ تھا کہ اس نے اپنی کتاب کا وہ حصہ پڑھنے سے انکار کردیا تھا جس میں رسول

اکرم ﷺ کی شان میں انتہائی گستاخ الفاظ درج تھے۔ہم نے اپنے خفیہ کیمرے کی مدد سے اس سین کی پوری فلم اتارلی جس کی لمبائی دوسوفٹ سے بھی کچھ اوپر تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ پیرس واپس آنے کے بعد اسرائیل سے لائی ہوئی میری شہادتوں کو یونیسکو والوں نے تسلیم کرلیا۔ڈائریکٹر جنرل نے ایسے اقدامات کیے کہ مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کے قائم کردہ تمام اسکولوں میں عربوں کا منظور شدہ درسی نصاب ازسرنو رائج ہوگیا اور اسرائیل کی لگائی ہوئی ۱۳ شرانگیز کتابیں بھی منسوخ ہوگئیں۔اس کے علاوہ آئندہ اس صورت حال پر کڑی نظر رکھنے کے لیے قابل اطمینان بندوبست بھی کردیا گیا۔''(یونیسکو)

کاش کہ ہمارے مسلم حکمران سمجھ سکیں کہ جن صیہونیوں کے ایما پر وہ اپنے ہاں کے قدیم تعلیمی نصابوں کی مسلسل ادھیڑ بن میں لگے ہوئے ہیں انہوں نے خود اپنے ملک میں دوسروں کے خلاف نفرت، نسلی برتری، بنیاد پرستی اور دوسروں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کو اپنی نصابی کتابوں کے ہر صفحے پر بکھیرا ہوا ہے۔عالمی امن کی خاطر اگر کسی اسلامی ملک کا تعلیمی نصاب تبدیل ہونا ناگزیر ہے تو انصاف کا تقاضا ہے کہ پھر ریاست اسرائیل کے تعلیمی نصاب کو بھی ازسرنو ترتیب دیا جانا چاہیے۔جس وقت عیسائی دنیا یہودیوں کو بری طرح مار رہی تھی اور وہ پناہ کی تلاش میں ساری دنیا میں مارے مارے پھر رہے تھے،اس وقت مسلم اسپین میں یہودیوں کو خوش آمدید کہا جارہا تھا اور پرسکون زندگی گزارنے کی سہولت دی جارہی تھی۔یہی وہ مسلم ہسپانیہ تھا جہاں پہنچ کر یہودیوں نے اپنی علمی وتخلیقی صلاحیتوں کو نکھار بخشا تھا۔اس بات کا اعتراف خود یہودی مفکرین آج بھی کرتے ہیں۔امریکی ربی Bengmain Blech نے اپنی کتاب *Jewish History and Culture* میں دل سے اعتراف کیا ہے کہ باقی عیسائی یورپ کو چھوڑ کر کریسنٹ اور اسٹار نے اس خطرناک دور میں جوسلوک ہمارے ساتھ کیا تھا،وہ اتنا شاندار تھا کہ بیان سے باہر ہے۔چنانچہ ہمارے مسلم حکمرانوں کو چاہیے کہ وہ یہودیوں کو یہ احساس دلائیں کہ اسرائیلی تعلیمی نصاب میں ہمارے اس احسان کا بھی ذکر کیا جائے۔یوں اسرائیلی طلبہ کو بھی اندازہو سکے کہ جب یہودی ہر طرف سے عیسائیوں کے ہاتھوں ظلم وجبر کا شکار تھے اس وقت یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے انہیں امن اور تحفظ فراہم کیا تھا۔(بشکریہ' معارف فیچر')

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

نیشنل کریکلم کونسل کی تشکیلِ نو کی جائے

* نصاب اور نصابی کتب کی اسلام اور نظریہ پاکستان سے مطابقت کو یقینی بنایا جائے۔
* نصاب و نظام تعلیم کو غیر ملکی NGOs اور سیکولر ولبرل عناصر کے شکنجے سے نکالا جائے۔
* انگریزی ذریعہ تعلیم اور مخلوط تعلیم کو ختم کیا جائے۔

تحریک اصلاح تعلیم کے ایک حالیہ اجلاس میں شرکاء نے ایک قرارداد میں مرکزی وزیر تعلیم سے مطالبہ کیا ہے کہ سنگل نیشنل کریکلم کے نام پر سابق وزیر تعلیم شفقت محمود صاحب نے غیر ملکی NGOs اور پاکستان بھر کے سیکولر ولبرل عناصر کو نیشنل کریکلم کونسل میں جمع کر کے ہیومنزم کی اقدار پر مبنی جو سنگل نیشنل کریکلم بنایا تھا اور جو نصابی کتب ترتیب دی تھیں، ضروری ہے کہ اس نصاب اور نصابی کتب پر نظر ثانی کی جائے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ نیشنل کریکلم کونسل کی موجودہ سیکولر، لبرل اور ناتجربہ کار ڈائریکٹر (مریم چغتائی) کو LUMS میں اس کی تدریسی جاب پر واپس بھیجا جائے اور اسلام اور نظریہ پاکستان پر یقین رکھنے والے پبلک سیکٹر یونیورسٹیوں کے تجربہ کار پروفیسرز کو اس کونسل میں رکن نامزد کیا جائے جو غیر ملکی NGOs کی فنڈنگ کو روک کر ملکی ذرائع سے اس کونسل کے منصوبوں پر عمل درآمد کریں۔

شرکاء نے اس رائے کا بھی اظہار کیا مرکزی وزارت تعلیم کریکلم ونگ کو پروفیشنل بنیادوں پر بحال کرنے پر غور کرے۔ اس میں تعیناتیاں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ذریعے کی جائیں اور اس میں سیاسی مداخلت بند کی جائے۔ یہ ادارہ صوبوں کی مشاورت اور رضامندی سے مجموعی پالیسی تیار کرے اور نصابی رہنمائی مہیا کرے۔ صوبائی ٹیکسٹ بک بورڈ نصابی کتابوں کے مسودے تیار کریں اور اس ادارے کی نیشنل ریویو کمیٹی (جس میں سارے صوبوں سے پروفیشنل ارکان موجود ہوں) ان پر نظر ثانی کرے تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جاسکے کہ نصاب اور نصابی کتب اسلام اور نظریہ پاکستان سے مطابقت رکھتی ہوں، قومی وحدت اور ہم آہنگی کا سبب بنیں اور فنی لحاظ سے بھی معیاری ہوں۔

شرکاء نے مطالبہ کیا کہ انگریزی ذریعہ تعلیم اور مخلوط تعلیم کو ختم کیا جائے۔

تعلیم و تربیت ڈاکٹر شہزاد اقبال شام

جامعات کی پی ایچ ڈی پر نظر

عدل کا تقاضا عدالت ہی سے نہیں ہوتا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں فیصلہ سازی کے وقت ہر شخص کو اپنے طرزِ عمل سے عدل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ متوازن نہ رہے تو ظلم کے راستے پر چل پڑتا ہے۔ زندگی معاشرتی ہو یا ازدواجی، دفتری انداز کار ہو یا تجارتی لین دین، ہر جگہ ہمارا واسطہ عدل سے ضرور پڑتا ہے۔ عدل کی خاطر انسانوں نے کچھ قواعد بنا رکھے ہیں۔ یہ قواعد، ازل سے نہ سہی، انسان کی معلوم معاشرتی زندگی میں ہر جگہ نظر آتے ہیں جو نفس امارہ کے اڑیل گھوڑے کو لگام دینے کے لیے ہوتے ہیں۔

اجتماعی زندگی میں ہمارا واسطہ اکثر اوقات مفادات کے ٹکراؤ سے پڑتا ہے۔ یہ عالمگیر انسانی قاعدہ ہے کہ کسی معاملے کے فریقین کے مفادات میں تصادم یا ہم آہنگی ہو تو ایک فریق کو قدم پیچھے کرنے کو کہا جاتا ہے۔ دفتری انٹرویو کرنے والوں میں سے کسی کا عزیز امیدوار ہو تو تقاضا کیا جاتا ہے کہ وہ باہر چلا جائے تاکہ باقی افراد آزادانہ انتخاب کریں۔ وکلاء کے چیمبر میں سے کوئی وکیل جج لگ جائے تو باقی ساتھی وکلا اس کی عدالت میں پیش نہیں ہوتے۔ مفادات میں ٹکراؤ نے یہ عالمگیر اصول طے کر دیا ہے۔

لیکن جب ہم اپنی یونیورسٹیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو بڑی دلخراش صورت حال دکھائی دیتی ہے۔ یہاں مفادات کا ٹکراؤ تو رہا ایک طرف، یہاں لوگوں نے باہم مفادات پیدا کر کے ان کے تحفظ کے لیے کلب سے بنا رکھے ہیں۔ مثلاً اسکالر جب ایم فل یا پی ایچ ڈی کا مقالہ تیار کر لے تو اسے متعلقہ میدان کے دو تین ماہرین کو جانچ کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ عارضہ قلب کا مریض، امراض قلب کے معالج ہی سے علاج کراتا ہے۔ جلدی مریض ڈرماٹولوجسٹ کے پاس جاتا ہے۔ کوئی مریض محض لفظ ڈاکٹر دیکھ کر ڈاکٹر کا تخصص دیکھے بغیر نہیں دوڑ پڑتا۔ پس داغ دہلوی کی شاعری پر مقالہ ہو تو ضروری ہے کہ وہ مقالہ اسی ماہر کو بھیجا جائے جس کی مہارت شاعری پر ہو نہ کہ

جس کا کام ڈرامے یا افسانے پر ہو۔علوم اسلامیہ کا اسکالر اگر علم الحدیث کا ماہر ہو تو تاریخ اسلام کا ماہر وہ مقالہ ہرگز نہ دیکھے۔اب کیا کیا جائے ہوتا اسی طرح ہے۔

ہائر ایجوکیشن کمیشن اس پر اگر کوئی بھرپور مطالعہ کرا سکے تو اسے تعجب ہوگا کہ جامعات کے تقریباً تمام اساتذہ تمام کاموں میں" ماہر" ہوتے ہیں۔کمیشن یہ بھی دیکھ سکے گا کہ یونیورسٹیوں کے بعض پروفیسر چند مخصوص یونیورسٹیوں میں ہر موضوع پر لکھے مقالوں کی جانچ کر کے سارا سال آراء دیتے رہتے ہیں۔متعدد دفعہ دیکھا گیا ہے، اور متعدد دردمند پروفیسروں نے سنایا کہ لوگ اپنے شعبے سے باہر کے تھیسس لے کر اور بغیر پڑھے وائیوا لینے چلے جاتے ہیں۔پروفیسر کی متعدد تدریسی وانتظامی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔تقریباً ہر پروفیسر اضافی کلاسیں لیتا ہے تاکہ اسے اضافی آمدن حاصل ہو۔خانگی زندگی اس کے علاوہ ہے۔اور وقت؟ سب کے پاس وہی 24 گھنٹے!اب عام آدمی کے لیے بھی یہ سمجھنا مشکل ہے کہ پروفیسر تین چار سو صفحات کے تھیسس کی جانچ اتنی جلدی کیسے کر لیتا ہے۔

اس تحقیق کے نتیجے میں کمیشن کو یہ بھی پتا چلے گا کہ اگر کراچی کے چند پروفیسر ملتان والوں کو تھیسس بھیج کر ان پر شفقت فرماتے ہیں تو جواباً وہ بھی انہیں نوازتے ہیں۔لاہور والوں کا دست شفقت اگر اسلام آباد والوں پر ہے تو وہ بھی انہیں اپنی کسی کانفرنس میں بلا کر چند دن تواضع کر دیتے ہیں۔تھیسس بھیجتے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جانچ کرنے والا پروفیسر اس خاص موضوع کا ماہر ہے بھی یا نہیں۔مثلاً کوئی سوشیالوجی میں پی ایچ ڈی ہے تو یہ اجمال کافی ہوتا ہے۔حالانکہ ممکن ہے کہ تھیسیس پولیٹیکل سوشیالوجی کے کسی ذیلی موضوع پر ہو اور جانچ والا پروفیسر کریمنل یا ریلیجس سوشیالوجی کا ماہر ہو۔یوں یہاں مفادات کا ٹکراؤ یا ہم آہنگی کا تو وہ سوال ہی نہیں جس کا شروع میں ذکر کیا گیا تھا۔یہاں تو طلبا سے بھاری فیس لے کر اور معیار نظر انداز کرتے ہوئے ایک دوسرے کو نوازا جاتا ہے۔آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ریٹائرڈ پروفیسر کو کانفرنسوں میں بہت کم" زحمت" دی جاتی ہے۔کیوں؟ کیونکہ اب وہ جواباً کسی کانفرنس میں آپ کو نہیں بلا سکتا۔تاہم ریٹائرڈ پروفیسر کو تھیسس بھیجا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ" تعاون" کرے۔

(بقیہ صفحہ نمبر:۵۵)

اسلام اور تجدد ڈاکٹر محمد امین

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ

عمار ناصر صاحب کی غامدی صاحب کی مدلل مداحی اور احمد جاوید صاحب کا ردّ

اجتہاد اور تجدید جائز۔تجدد نا قابلِ قبول

غامدی صاحب کا سارا کام مبنی بر تجدد ہے اور یہ دین کی نئی تعبیر ہے جو قابل ردّ ہے
کیونکہ یہ بدعت ہے، دین ماسوا اللہ کی طرف دعوت ہے اور خلاف حمیت ہے

غامدی صاحب اور ان کے مریدین کا طرزِ عمل بھی خوب ہے کہ احمد جاوید صاحب جب غامدی صاحب کی تعریف کرتے ہیں تو وہ اسے خوش آمدید کہتے ہیں اور جہاں وہ اشارتاً بھی ان کی کسی خامی کا ذکر کرتے ہیں، خواہ وہ تحسین آمیز انداز ہی میں ہو، وہ اسے رد کر دیتے ہیں۔

عمار ناصر صاحب نے اپنی فیس بک وال پر آٹھ قسطوں میں احمد جاوید صاحب کے غامدی صاحب کے بارے میں موقف پر جو تبصرہ کیا ہے، اس میں وہ کہتے ہیں کہ غامدی صاحب نے دین کو اس طرح پیش کیا ہے جس طرح نبی کریم ﷺ نے کیا تھا اور یہ کہ انہوں نے دین کی نئی تعبیر کی ہے اور یہ ایک بڑا علمی اور تجدیدی کام ہے جسے روایتی علماء کرام اور ان کے حامی برداشت نہیں کرتے اور جذباتی انداز میں اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

ہم عمار ناصر صاحب کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ ہم جیسے روایتی اسلام کے علمبردار بھی قرآن وسنت اور فقہاء و مجتہدین کے کام میں فرق کرتے ہیں۔ جو قرآن وسنت میں ہے وہ دین ہے، وہ شریعت ہے، وہ مقدس، حتمی اور نا قابل تغیر ہے اور اس میں غلطی کا امکان نہیں۔ اور جو کچھ فقہاء و مجتہدین کہتے ہیں وہ دین نہیں، دین کی تشریح ہے، اس کی وضاحت ہے، اس سے استنباط کردہ مسائل ہیں جو اجتہاد پر مبنی ہیں۔ ان میں غلطی کا امکان ہے اور وہ قرآن وسنت کی طرح مقدس اور نا قابل تغیر بھی نہیں کیونکہ زمان ومکان کی تبدیلی سے، حالات کے تغیر اور علت کے بدل جانے سے اجتہادی احکام بدل بھی جاتے ہیں۔ تو پھر اختلاف اور جھگڑا کس بات میں ہے؟

جمہور علماء امت اور غامدی صاحب و عمار ناصر صاحب (جیسے متجد دین) میں بنیادی

اختلاف اس بات پر ہے کہ جمہور اہل علم تجدید و اجتہاد کو جائز سمجھتے ہیں لیکن تجدد اور دین کی نئی تعبیر کو جائز نہیں سمجھتے جبکہ غامدی صاحب کا سارا کام مبنی بر تجدد ہے اور وہ دین کی نئی تعبیر ہے۔ جمہور علماء تجدد (اور نئی تعبیر دین) کو پانچ وجوہ سے ردّ کرتے ہیں:

۱۔ یہ ماسوا اسلام کی طرف دعوت ہے

۲۔ یہ بدعت ہے

۳۔ کفار و اہل کتاب سے دوستی خلاف قرآن ہے

۴۔ یہ خلاف حمیت ہے

۵۔ یہ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ علمی روایت کے خلاف ہے

اور اب ان کی کچھ تفصیل جسے ہم مندرجہ ذیل عناوین سے زیر بحث لائیں گے:

* اجتہاد، تجدید اور تجدد میں فرق
* غامدی صاحب کا سارا کام مبنی بر تجدد اور دین کی نئی تعبیر ہے
* تجدد اور نئی تعبیر دین کے قابل ردّ ہونے کے شرعی و عقلی دلائل

اجتہاد، تجدید اور تجدد میں فرق

اس امر کو سمجھنے کے لیے کہ اسلام میں اجتہاد اور تجدید جائز ہے لیکن تجدد قابلِ قبول نہیں، ضروری ہے کہ ان تینوں میں فرق کو سمجھا جائے۔

اجتہاد یہ ہے کہ جس نئے امر میں قرآن و سنت کی نصوص میں واضح حکم موجود نہ ہو وہاں اجتہاد کے ذریعے حکم شرعی دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام کیسے کیا جائے؟ اس کے لیے مسلمان علماء و فقہاء نے بے نظیر تحقیق کر کے ایک پورا شعبۂ علم اور ڈسپلن ایجاد کیا ہے جسے علم اصول الفقہ کہا جاتا ہے۔ اس میں ان ادلہ اور امارات کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے جن کی مدد سے اجتہاد کیا جاتا ہے جو فہم نصوص، نصوص پر قیاس اور نصوص سے استنباط پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں استحسان، سدّ الذریعہ، استصحاب حال، مصالح مرسلہ، عرف، شرع ما قبل، قول صحابی، قواعد فقہیہ، مقاصد الشریعہ، انفرادی اجتہاد اور اجماع وغیرہ کے مباحث شامل ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اجتہاد سے مراد مجتہد کا

اپنی آزاد مرضی سے رائے قائم کرنا نہیں ہے یا اپنی رائے سے فہم نصوص کی کوشش کرنا نہیں ہے بلکہ یہ کام کچھ قواعد وضوابط کی پابندی کا تقاضا کرتا ہے۔ سادہ لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کام نصوص قرآن وسنت کی روشنی میں ہوگا، اس میں مقاصد شریعہ کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور یہ شرعی امور میں آزادانہ رائے قائم کرنے کا نام نہیں ہے۔ جمہور علماء اور جمہور امت اجتہاد کو ناگزیر سمجھتی ہے۔ اس کے دلائل معروف ہیں اور انہیں دہرانے کی یہاں ضرورت نہیں۔

تجدید یہ ہے کہ لوگ نصوص کے ناقص فہم یا ناقص اجتہاد سے دین میں حک واضافہ کر لیتے ہیں اور افراط وتفریط میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسے شرعی اصطلاح میں بدعت کہا جاتا ہے۔ مجدد کا کام یہ ہے کہ وہ دین کو ان حشو وزوائد سے پاک کر کے اس اصل کے مطابق اسے پیش کرے جو قرآن وسنت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ ہر عہد میں مسلمانوں میں ایسے لوگ آتے رہیں گے جو تجدید دین کا کام کرتے رہیں گے[۱] یعنی لوگوں نے دین میں جو اضافے کر لیے ہیں وہ انہیں چھانٹ کر الگ کر دیں گے۔ ان زوائد اور غیر اسلامی رسوم ورواج اور غیر اسلامی تشریحات کو رد کر کے وہ دین کا صحیح اور اُجلا چہرہ لوگوں کے سامنے پیش کریں گے جو قرآن وسنت کے مطابق ہو۔

بدعت کیا ہے اور دین میں اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس بارے میں نبی کریم ﷺ کی دو احادیث بالکل واضح ہیں۔ آپ نے فرمایا:

* "وكلُّ مُحدَثةٍ بدعةٌ، وكلُّ بدعةٍ ضلالةٌ، وكلُّ ضلالةٍ في النَّارِ"[۲]

ہر نئی بات 'بدعت' ہے، ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر بدعت کا مآل جہنم کی آگ ہے۔

* "مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ"[۳]

یعنی جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی بات ایجاد کی جس کی اصل اس میں نہ ہو تو وہ

---

[۱] سنن ابی داود، رقم الحدیث: ۴۲۹۱
[۲] سنن النسائی، ۳/۱۸۸
[۳] صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۴۹۳

قابل ردّ ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دین میں وہ نئی بات گمراہی نہیں ہے جس کی اصل دین میں موجود ہو۔ اصل سے مراد یہ ہے کہ نصوص سے بداہتاً یا استنباطاً اس کا پتا چلتا ہو یا وہ نصوص کے مقاصد کے خلاف نہ ہو۔ عہد صحابہ میں اس کی کئی مشہور مثالیں ہیں جیسے حضرت عمرؓ کا مساجد میں باجماعت تراویح کا انتظام کرنا کیونکہ اس کی اصل سنت میں موجود تھی۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اجتہاد بدعت نہیں ہے کیونکہ اس کی اصل دین میں موجود ہوتی ہے۔

تجدیداور اجتہاد کے مقابلے میں تجدد وہ نئی بات ہے جس کی اصل دین میں نہ ہو یا اس کا ماخذ ومرجع اسلام کی بجائے کوئی دوسرا ایسا دین، شریعت، تہذیب، عرف ہو جو اسلام کے خلاف ہو۔ گویا صحیح اجتہاد اور صحیح تجدید 'تجدد' نہیں ہیں کیونکہ ان کی اصل تو اسلام میں موجود ہے۔ لیکن ہر ایسا اجتہاد تجدد ہے جس کی اصل اسلام میں نہ ہو یا جس کا ماخذ ومرجع غیر اسلام ہو یا وہ اسلامی شریعت کے مقاصد کی بجائے کسی دوسرے دین، تہذیب، عرف کے مقاصد کو پورا کرنے والا ہو۔ اسی طرح صحیح تجدید تجدد نہیں ہے کیونکہ تجدید کا معیار تو قرآن وسنت ہے اور تجدد تو ہے ہی یہ کہ جوئی بات حقیقتاً مطابق دین نہ ہو اسے غلطی سے مطابقِ دین سمجھ کر قبول کر لیا جائے۔ اس وضاحت سے ثابت ہو گیا کہ تجدد نہ صحیح اجتہاد ہے نہ صحیح تجدید۔

غامدی صاحب کا سارا کام تجدد اور دین کی نئی تعبیر ہے

تجدد بروزن تفعّل ہے یعنی کسی کام میں شدت اور تکلف وتصنع سے کام لینا۔ دینی پس منظر میں اس سے مراد ہے ایسی تجدید اور ایسا اجتہاد جس کی اصل قرآن وسنت میں نہ ہو بلکہ اس کی بنیاد ماسوا اسلام کسی دوسرے نظریۂ حیات پر ہو جیسے آج کل دنیا میں مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ ہے۔ مسلمان پچھلی دو صدیوں سے مغربی استعمار کے غلام رہے ہیں اور آج بھی بہت سے مسلمان اہل علم مغرب کے فکری غلام ہیں تو تجدد سے مراد ہے ایسا اجتہاد کرنا جو قرآن وسنت کی روشنی میں نہ ہو بلکہ مغربی فکر وتہذیب سے مرعوب ہو کر، اس کی پیروی کے لیے جواز مہیا کرنے کی خاطر کیا جائے۔

ہم غامدی صاحب کے 'اجتہادات' اور' کار تجدید' کو تجدد اسی لیے کہتے ہیں کہ ان کے

سارے کام کی بنیاد دین کی ایسی تشریح ہے جو اسے مغرب کی الحادی فکر و تہذیب کے مطابق بنا دے۔ مغرب اپنی الحادی فکر و تہذیب کو مسلم معاشرے میں نافذ و غالب کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے اور وہ اپنی مساعی نامشکورہ میں اس لیے کامیاب ہے کہ اکثر مسلم ممالک کے حکمران اور اشرافیہ ان کے زیر اثر ہیں، ان سے مغلوب ہیں، ان کی جائز و ناجائز مانتے ہیں۔ اس ماحول میں غامدی صاحب کمزور ایمان و عمل کے حامل مسلمانوں کے مغرب پرستانہ رویوں اور اقدامات کو، جو اپنی اصل میں غیر اسلامی ہیں، اپنے 'اجتہادات' اور 'کارِ تجدید' سے عین اسلامی قرار دے رہے ہیں۔

ہم نے جون ۲۰۱۵ء کے البرہان میں '....' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں ایک جدول تھا جس میں اسلام، مغرب اور غامدی صاحب کے 'اجتہادات' کا آمنے سامنے رکھ کر جائزہ لیا گیا تھا اور ثابت کیا گیا تھا کہ غامدی صاحب کے سارے 'اجتہادات' اسلام کی بجائے فکرِ مغرب کے مطابق ہیں۔ ہم یہاں اس کا خلاصہ قارئین کے سامنے رکھتے ہیں تا کہ ان پر واضح ہو جائے کہ غامدی صاحب (اور ان کے تلامذہ) کی ساری فکر مغربی تہذیب کے مظاہر و اعمال کو مطابقِ اسلام ثابت کرنے تک محدود ہے۔

۱۔ معاشرت

اسلام حیاء و عصمت کا علم بردار ہے جبکہ مغرب اس کے برعکس مادر پدر آزاد ہے۔ غامدی صاحب کا اجتہاد یہ ہے کہ دوپٹے کی کوئی شرعی حیثیت نہیں۔ برقع کی جتنی شکلیں ہیں وہ لوگوں نے خود بنا رکھی ہیں اور رسم و رواج پر مبنی ہیں۔ مسلمان لڑکی لڑکا آن لائن دوستی کر سکتے ہیں۔ ایک مسلمان ہندو لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ تصویر اور گانا بجانا جائز ہے۔

۲۔ عقائد

غامدی صاحب وہ 'سنت' کی ایسی تعریف کرتے ہیں جو آج تک کسی مسلمان عالم نے نہیں کی اور اس کے ذریعے سنت کے کردار کو محدود کر دیتے ہیں اور مسلمانوں میں مروج ذخیرۂ احادیث کو سنت سے خارج کر دیتے ہیں۔ وہ بہت سی احادیث بزعم خود مطابقِ قرآن نہ ہونے پر رد کر دیتے ہیں اور احادیث کو تفسیر قرآن کا ماخذ نہیں سمجھتے۔ وہ یہ سب اس لیے کرتے ہیں تا کہ مغربی فکر و تہذیب کے پیدا کردہ اعمال کو 'خلاف سنت' قرار دینے سے بچا سکیں۔ وہ جمہور

مسلمانوں کی طرح نزول مسیح (علیہ السلام) کے قائل نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی غیر مسلم کو 'کافر' نہیں کہنا چاہیے۔ علماء کسی کو 'کافر' قرار نہیں دے سکتے۔ نجات اخروی کے لیے مسلمان ہونا ضروری نہیں۔ انہیں قادیانیت سے ہمدردی ہے کیونکہ وہ اہل مغرب کا کاشتہ پودا ہے اور مغرب اس کا حامی ہے۔ انہیں بیت المقدس پر مسلمانوں کے مقابلے میں یہودیوں کا حق فائق لگتا ہے کیونکہ مغرب اسرائیل کا حامی ہے۔

۳۔ قوانین

مغرب چونکہ زنا بالرضا کو جائز قرار دیتا ہے اور صرف زنا بالجبر کی مذمت کرتا ہے اس لیے غامدی صاحب کہتے ہیں کہ رجم کی سزا تو قرآن مجید میں ہے ہی نہیں اور زنا بالرضا کی سزا سو کوڑے ہیں۔ قتل کی سزا صرف زنا بالجبر میں حرابہ ہونے کی وجہ سے ہے؛ حالانکہ یہ موقف صریحاً خلاف سنت ہے، صرف فقہاء کی بات نہیں۔ اسی لیے انہوں نے جنرل مشرف کے دور میں اہل مغرب کی تائید سے ان قوانین کی حمایت میں مہم چلائی جن کا مقصد زنا بالرضا کی سزا کو مشکل اور نا قابل عمل بنانا تھا۔ اسی طرح سارے مسلمان اور جمہور علماء قرآن حکیم اور سنتِ رسول کی رُو سے شاتم رسول کی سزا قتل قرار دیتے ہیں جبکہ غامدی صاحب اسے غیر شرعی قرار دیتے ہیں کیونکہ مغرب اس کے خلاف ہے۔

۴۔ سیاست

غامدی صاحب اسلامی ریاست اور اسلامی ریاست کی ضرورت، اہمیت اور کردار کے قائل نہیں۔ وہ مغرب کی قومی ریاست اور جمہوریت کے قائل ہیں جو ہیومنزم، سیکولرزم اور لبرل ازم پر مبنی ہوتی ہے۔

تجدد اور نئی تعبیرِ دین کے قابلِ ردّ ہونے کے شرعی و عقلی دلائل

غامدی صاحب کے متجددانہ افکار کا نتیجہ ہے ان کی نئی تعبیرِ دین۔ جمہور علماء کی حمایت میں ہم بھی ان کے متجددانہ افکار اور نئی تعبیر دین کو غلط اور گمراہ کن سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں ذہن سازی کے اکثر ذرائع خصوصاً جدید تعلیم اور میڈیا چونکہ اہل مغرب اور ان کی ملحدانہ فکر و تہذیب کے زیر

اثر ہیں، اس لیے ممکن ہے بعض جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو ہماری بات سمجھنے میں دقت پیش آئے اور وہ کہیں کہ آپ کے پاس اپنے مؤقف کے حق میں کیا شرعی اور عقلی دلائل ہیں تو ایسے لوگوں کی خدمت میں ہم مندرجہ ذیل حقائق اور دلائل پیش کرنا چاہیں گے:

۱۔ یہ غیر اسلام کی طرف دعوت ہے

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے نزدیک صحیح دین صرف اسلام ہے، اس نے نبی کریم ﷺ کو اس لیے مبعوث فرمایا تھا کہ اللہ کا دین دوسرے غلط ادیان پر غالب آجائے اور یہ کہ اسلام کے سوا کوئی اور دین اللہ کو قبول نہیں ہے:

* ﴿إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾[آل عمران ۳:۱۹]

* ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾[التوبہ ۹:۳۳]

* ﴿وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ﴾[آل عمران ۳:۸۵]

یہ بھی ذہن میں رہے کہ قرآن حکیم نے 'دین' کا لفظ جن معنوں میں استعمال کیا ہے ان معنوں میں اور حقیقتاً بھی مغربی فکر وتہذیب ایک مکمل 'دین' ہے۔ وہ ایک مکمل طرز حیات ہے۔ اس کا اپنا ایک ورلڈ ویو ہے۔ وہ مذہب اور آسمانی ہدایت کو بطور نظام حیات رد کرتا ہے۔ وہ خود کو 'دین' اس لیے نہیں کہتا اور لوگ بھی اسے 'دین' یا مذہب (Reliegion) اس لیے نہیں کہتے کہ دین (اور مذہب) کے بارے میں عام تصور یہ ہے کہ وہ آسمانی ہدایت پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ مغربی فکر وتہذیب کا خالق انسان خود ہے یعنی انسان اور اس کی عقل وتجربہ۔

دوسری ناقابل انکار بات یہ ہے کہ مغربی فکر وتہذیب ایک ایسا 'دین' ہے جو اسلام سے بالکل متضاد ہے۔ اسلام میں ایک اللہ کا ہمہ جہت تصور ہے۔ انسان اس کا عبد ہے۔ زندگی اس نے اللہ کے احکام کے مطابق گزارنی ہے۔ آخرت میں کامیابی اس کی منزل ہے؟ جبکہ مغربی فکر وتہذب اللہ کا انکار کرتی ہے۔ اس میں انسان خود مختار اور قادر مطلق ہے۔ زندگی بس دنیا کی زندگی ہے جو اس نے اپنی مرضی اور خواہشات کے مطابق گزارنی ہے۔ یوں مغربی فکر وتہذیب کی

آئیڈیالوجی اور اس کے نظریات (ہیومنزم، سیکولرازم، کیپٹل ازم، ایمپریسزم وغیرہ) توحید، رسالت، آخرت اور وحی کا انکار کرتے ہیں۔ اسلام کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہیں اور اس طرح کے عقائد کو قرآن کفر سے تعبیر کرتا ہے[۱]

لہٰذا اسلامی عقائد واحکام کی تشریح مغربی فکر وتہذیب کی روشنی میں کرنا واضح طور پر غیر اسلام کو قبول کرنے کے مترادف ہے۔ جس کی قرآن واضح اور شدید الفاظ میں مذمت کرتا ہے لہٰذا مغربی فکر وتہذیب سے متاثر ومرعوب ہو کر اسلامی احکام کی تشریح کرنا تجدد کی بدترین مثال ہے۔

۲۔ تجدد بدعت ہے

ہم سطور بالا میں وہ صحیح احادیث پیش کر چکے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اسلام میں 'احداث فی الدین' یعنی دین میں ایسی باتیں شامل کرنا جن کی اصل اس میں نہ ہو، بدعت مذمومہ ہیں۔ یہ گمراہی ہے اور گمراہی کا نتیجہ جہنم ہے۔ یہ اتنی سخت وعید ہے کہ ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے لوگوں کا شمار قیامت میں 'امت محمدیہ' میں نہ ہوگا اور وہ حوض کوثر کے حیات بخش ٹھنڈے میٹھے پانی سے اس دن محروم ٹھہریں گے جس دن سورج گویا سوا نیزے پر ہوگا اور پیاس سے جان لبوں پر آ رہی ہوگی۔ اسی لیے صالح علماء ہمیشہ احداث فی الدین سے بچنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں اور اس کی دعا بھی کرتے ہیں۔ اسلامی احکام کی تشریح مغربی فکر وتہذیب کی روشنی میں کرنا اور اس کے مقاصد اور اہداف کے مطابق کرنا جبکہ اس تہذیب کا 'دین' ہونا اور خلاف اسلام ہونا واضح ہے، اس سے بڑی بدعت کیا ہو سکتی ہے؟ اور اسے اگر تجدد نہ کہا جائے اور اس تجدد کو مذموم اور گمراہی نہ سمجھا جائے تو بتائیے اور کیا کیا جائے؟

۳۔ قرآن وسنت اہلِ کتاب اور کفار سے دوستی سے منع کرتے ہیں

قرآن حکیم میں متعدد آیات میں اہل کتاب کو کفار کہا گیا ہے[۲] اور اہل کتاب اور کفار سے

---

[۱] العنکبوت ۲۹: ۷۔۴، ص ۳۸: ۴

[۲] البینہ ۹۸: ۶، الحشر ۵۹: ۱۱

دوستی سے منع کیا گیا ہے[1] اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں، وہ تمہارے بدخواہ ہیں، وہ تمہیں دین سے پھیرنا چاہتے ہیں[2]۔اب یہ بتائیے کہ جن لوگوں کے بارے میں قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں اور تمہیں دین سے پھیرنا چاہتے ہیں، جو شخص ان کے دین، ان کی تہذیب کی تعریف کرے، اسلامی احکام کی تشریح اس تہذیب کے مطابق کرے، اگر ہم اس کے کام کو تجدد نہ کہیں، اس کے اس اسلوب کی مذمت نہ کریں تو کیا کریں؟ مذکورہ چند آیات ملاحظہ ہوں:

۴۔ تجدد اور مغرب کی پیروی خلافِ حمیت ہے

نہ صرف مغربی فکر وتہذیب اسلام سے مختلف ہے بلکہ یہ اس کی ضد ہے اور اس کی نقیض ہے، جیسا کہ اوپر اشارتاً ذکر ہوا بلکہ اس تہذیب کے علمبردار مغربی ممالک (امریکہ، یورپ اور ان کے حلیف) اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔اور یہ دشمنی آج کی نہیں ہے جب یہ اہل کتاب کے طور پر مشہور تھے تو اس وقت بھی انہوں نے، عہد نبوت سے لے کر آج تک، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو سکا، کیا۔صلیبی جنگیں بھی اسی کا شاخسانہ تھیں۔ پھر جب مسلم ممالک کمزور ہوئے تو انہوں نے مسلمان ممالک پر قبضہ کر لیا۔انہیں کچلا، لوٹا اور تباہ کیا۔انہیں غلام بنایا اور ہمیشہ غلام رکھنے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مکروہ سازشیں کیں۔مسلمانوں نے ان کے خلاف آزادی کی تحریکیں چلائیں۔ یہ مسلم ممالک کو آزاد کرنے پر مجبور ہوئے تو انہوں نے امن کا چولا پہن لیا اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پر امن سازشیں جاری رکھیں، ان کو اپنی فکر وتہذیب کا رسیا بنانے کی کوششیں کیں، ان کو اسلام سے دور رکھنے کی کوششیں کیں اور جب انہوں نے دیکھا کہ کچھ مسلمان ممالک سر اٹھانے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو انہوں نے ان مسلمان ممالک کو پھر طاقت سے کچلنے کی راہ اپنالی۔ ہمارے دیکھتے انہوں نے عراق، افغانستان اور لیبیا کو تباہ کیا۔یمن اور شام تباہ کیے جا رہے ہیں اور پاکستان وایران پر شدید دباؤ جاری ہے۔

سوال یہ ہے کہ جو مصنف، دانشور اور عالم ان حالات میں اسلام اور مسلمانوں کے دشمن اہل

---

[1] آل عمران ۳:۱۱۸، ۱۱۹

[2] البقرہ ۲:۱۲۰

مغرب کا ساتھ دیتا ہے، ان کی فکر وتہذیب کو سراہتا ہے، اپنے دین کی تشریح ان کی فکر وتہذیب کے مطابق کرتا ہے، اسے اگر ہم بے حمیتی نہ کہیں تو کیا کہیں؟ یہ تو تجدد سے بڑھ کر اسلام اور ملت سے غداری ہے۔ یہ وہی کام ہے جو غلام احمد قادیانی نے کیا۔ جو بھی آج یہ کام کرے گا، مسلم علماء اور عوام اس پر نفرین بھیجنے میں حق بجانب ہوں گے۔

۵۔تجدد اور دین کی نئی تعبیر چودہ سوسالہ مسلم علمی روایت کی نفی ہے

اجتہاد اور تجدید مسلم علمی روایت کا حصہ ہیں جبکہ تجدد اور دین کی نئی تعبیر ساڑھے چودہ سوسالہ مسلم علمی روایت کی نفی ہے۔ دین کی نئی تعبیر تجدد ہی کا نتیجہ ہے۔ اجتہاد جائز ہے۔ اجتہاد میں تعدد اور اختلاف بھی جائز ہے لیکن دین کی نئی تعبیر جائز نہیں۔ دین کی نئی تعبیر کا مطلب ہے کہ آپ نئے سرے سے طے کریں کہ دین کیا ہے؟ اس کے مآخذ کیا ہیں؟ اس کا نصب العین کیا ہے؟ اس کی ترجیحات کیا ہیں؟ وغیرہ۔ اسلام میں یہ سب چیزیں طے ہیں۔ قرآن وسنت نے اس بارے میں جو کچھ کہا ہے اس پر امت کے مفسرین، محدثین، علماء، فقہاء، مجتہدین ساڑھے چودہ سوسال سے اس پر متفق ہیں۔ ساری امت اس پر متفق ہے اور یہی اس کا تعامل ہے۔

آج کسی عالم اور دانشور کا یہ کہنا کہ ساڑھے چودہ سوسال تک کسی نے نہیں سمجھا کہ دین کیا ہے؟ دین کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا نصب العین کیا ہے؟ اس کے مآخذ کیا ہیں؟ اور دین کی اصل حقیقت وہ ہے جو میں بتا رہا ہوں، دین کا اصل نصب العین وہ ہے جو میں بتا رہا ہوں۔ دین کے حقیقی ماخذ وہ ہیں جو میں بتا رہا ہوں تو یہ بات عقلی، علمی اور منطقی لحاظ سے اتنی کمزور ہے کہ اسے ردّ کیے بغیر اور احداث فی الدین قرار دیے بغیر چارہ نہیں۔ اور اس بات کی کیا دلیل ہے اور اس دلیل میں کیسے وزن ہے کہ ساڑھے چودہ سوسال تک امت اور اس کے مفسرین، محدثین، علماء، فقہاء، مجتہدین نہیں سمجھ سکے کہ صحیح دین کیا ہے اور آپ سمجھ گئے ہیں کہ صحیح دین یہ ہے۔

امت کی چودہ سوسالہ علمی روایت اور تعامل کو غلط کہنے اور ردّ کرنے کی بجائے آپ کو کیوں نہ ردّ کر دیا جائے اور آپ کو کیوں نہ غلط قرار دیا جائے کیونکہ اسلاف (جس میں صحابہ اور تابعین یعنی **قرون مشہود لہا** بھی شامل ہیں جن کے صحیح ہونے کی گواہ حدیث دیتی ہے[۱]) آپ سے

---

[۱] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۶۵۱

زیادہ متقی تھے، آپ سے زیادہ عربی جانتے تھے اور آپ سے زیادہ دین کا فہم رکھتے تھے۔ تو کیا ان سب کی دینی تشریح کو ہم ٹھکرا دیں اور آپ کی اس دینی تشریح کو صحیح مان لیں جو آپ غیر اسلام یعنی مغربی فکر و تہذیب کی روشنی میں کر رہے ہیں تو کیا آپ پر وحی اتری ہے؟ کیا دین آج نازل ہوا ہے کہ آپ ہمیں دین کا صحیح مفہوم بتانے چلے ہیں؟

خلاصہ یہ کہ علم و عقل کا تقاضا ہے کہ پوری امت اور اس کی ساڑھے چودہ سوسالہ علمی روایت کو رد کرنے والے متجدد دین اور غامدی صاحب کے اس فہم دین کو رد کر دیا جائے جس کی رو سے وہ دین کی نئی تعبیر کر رہے ہیں۔ وہ 'سنت' کے اس مفہوم کو رد کرتے ہیں اور اس سارے ذخیرۂ حدیث کو رد کرتے ہیں جن پر امت صدیوں سے عامل ہے۔ وہ قرآن کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو آج تک کسی نے نہیں کی۔ وہ دینی احکام کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو آج تک کسی نے نہیں کی۔ وہ دینی احکام کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو آج تک کسی نے نہیں کی اور وہ یہ سب کچھ مغربی فکر و تہذیب کی روشنی میں کرتے ہیں، اس پر عمل کا جواز ثابت کرنے کے لیے کرتے ہیں تا کہ لوگ اپنے ماضی سے کٹ جائیں، ماضی کی علمی روایت سے کٹ جائیں اور مغربی تہذیب کے اصول و اقدار کو اپنالیں۔ اس فکری افلاس پر ماتم تو کیا جاسکتا ہے اس کی تحسین نہیں کی جاسکتی اور نہ اسے قبول کیا جاسکتا ہے۔

ماں باپ کی بددعا سے بچو

زمخشری کہتے ہیں کہ جب میں بچہ تھا تو ایک چڑیا سے کھیل رہا تھا جس کے پاؤں سے مَیں نے دھاگہ باندھ رکھا تھا۔ ماں نے مجھے منع کیا لیکن میں باز نہ آیا یہاں تک کہ دھاگے سے چڑیا کا پاؤں کٹ گیا۔ میری ماں نے غصے سے کہا کہ اللہ تیرا بھی پیر کاٹے۔ یہ بددعا میرے بڑھاپے میں جا کر پوری ہوئی جب میرے پیر میں ایسا زخم ہوا جو ٹھیک نہ ہوا اور اسے کاٹنا پڑا۔

لہٰذا ماں کی نافرمانی سے اور اس کی بددعا سے بچو۔

اسلام اور پاکستان　　ڈاکٹر محمد امین

منصورہ لاہور میں سود کے خلاف اجلاس سے مدیر البرہان کا خطاب

سود اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف منظم تحریک کی ضرورت

نہ صرف انسداد سود بلکہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے غلبے کے خلاف اور اسلام کے معاشی نظام کی بحالی کے لیے تحریک چلانی چاہیے اور اسے سارے شعبہ ہائے حیات میں اسلامی احکام کے غلبے کا ابتدائیہ بنانا چاہیے۔

* سود کے خلاف وفاقی شرعی عدالت نے حال ہی میں جو فیصلہ دیا ہے اس میں جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی نے بلاشبہ بڑی محنت کی ہے جس پر وہ مبارکباد کی مستحق ہیں۔ ہم نے بھی حصہ بقدر جُثہ اس کے لیے کام کیا ہے۔ راقم جب پنجاب یونیورسٹی میں کام کرتا تھا تو اس نے علوم اسلامیہ سے متعلق پروفیسرز اور محققین کو جمع کر کے سپریم کورٹ اپیل بنچ کے سربراہ جسٹس خلیل الرحمن صاحب (جو سود کے خلاف اپیل سن رہے تھے) کے توجہ دلانے پر ان کے مرتب کیے گئے سوالات کا مشترکہ جواب بھجوایا تھا۔ یہی کوشش ہم نے ۲۰۱۳ء میں دوبارہ کی جب ملی مجلس شرعی کے تحت سارے دینی مکاتب فکر کے علماء کرام کی طرف سے وفاقی شرعی عدالت کے اٹھائے گئے سترہ نکات کا متفقہ جواب بھجوایا تھا۔ پھر مجلس نے ایک 'انسداد سود کمیٹی' قائم کی جس کا کنوینر مولانا زاہد الراشدی صاحب کو بنایا گیا۔ اسے بعد میں مولانا کے مشورے سے 'تحریک انسداد سود' کا نام دیا گیا اور مولانا زاہد الراشدی صاحب اس عنوان سے مسلسل کئی سالوں سے تاجروں، وکیلوں، اور دینی حلقوں میں کام کر رہے ہیں۔ فجزاھم اللہ عنا خیر الجزاء

* پہلے مرحلے میں کوشش کرنی چاہیے کہ اس فیصلے کے خلاف کوئی اپیل میں نہ جائے۔ یہ فیصلہ دو دہائیوں بعد ہوا ہے اور دیکھا جائے تو سود کا معاملہ پچھلے پچاس سال سے عدالتوں میں دھکے کھا رہا ہے جس کے پیچھے یہ حقیقت ہے کہ ہماری حکومتیں اور حکمران طبقے بلاسود معیشت پر کام نہیں کرنا چاہتے کیونکہ یہ چیز اس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جاتی ہے جو مغرب کے ہاں ہی نہیں، پاکستان میں بھی غالب ہے۔ پہلے بھی حکومت نے پس پردہ رہ کر ایک بینک سے اپیل کرا دی تھی اور اب بھی اس کا امکان موجود ہے۔ آج کی مجلس کے شرکاء اور دینی جماعتوں کو اس غرض سے سخت پیغام جاری کرنا چاہیے کہ جس بینک نے بھی اس فیصلے کے خلاف اپیل کی، دینی جماعتیں اس کے خلاف ملک گیر تحریک چلائیں گی اور عوام سے کہا جائے گا کہ اس بینک سے لین دین ختم

کردیا جائے۔ اسی طرح پبلک میں یہ اعلان بھی کیا جائے کہ اگر کسی فرد نے اس طرح کی اپیل کی تو وہ ساری قوم کی طرف سے نفرین اور مقاطعے کا مستحق ٹھہرے گا کیونکہ اللہ ورسول کے خلاف جنگ کو جاری رکھنا کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔

* پاکستانی معیشت سے سود کے خاتمے کا فیصلہ بلاشبہ ایک بڑی پیش رفت ہے (بشرطیکہ اس پر خلوص نیت سے عمل بھی کیا جائے جس کا بظاہر حکومتی حلقوں میں فقدان نظر آتا ہے)۔ سود کا خاتمہ ہونا چاہیے اور اس فیصلے کے نفاذ کے لیے دینی قوتوں کو منظم جدوجہد جاری رکھنی چاہیے تاہم واضح رہے کہ پاکستان کے معاشی مسائل کے حل کے لیے اور اسلامی معاشی نظام کے قیام کے لیے صرف سود کا خاتمہ کافی نہیں ہے۔ اس ضمن میں چار باتیں ذہن میں رکھنی چاہئیں:

برائے نام 'اسلامی بینکنگ'

ایک یہ کہ اگر کوئی سمجھتا ہے کہ پاکستانی معیشت سے سود ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کنونشنل بینکنگ کو موجودہ طرز کی اسلامی بینکنگ میں تبدیل کردیا جائے تو ہماری رائے میں اس کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا اور نہ اس کے ہماری معیشت پر کوئی مفید اثرات پڑیں گے کیونکہ یہ ''اسلامی بینکنگ'' برائے نام ہی اسلامی ہے۔ پاکستان میں اس کے حامی صرف مفتی تقی عثمانی صاحب ہیں۔ وہ ہمارے لیے بہت محترم ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے اساتذہ اور دوسرے بہت سے دیوبندی اکابر نے اس ''اسلامی بینکنگ'' کو قبول کرنے اور اسے اسلامی ماننے سے انکار کردیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ موجودہ اسلامی بینکنگ اکثر معاملات میں حیلوں پر مبنی ہے اور برائے نام ہی اسلامی ہے لہٰذا اگر سارے کنونشنل بینک موجودہ طرز کے اسلامی بینکوں میں تبدیل بھی ہو جائیں تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔

اسلام کے معاشی نظام کا قیام

دوسرے یہ کہ معیشت سے سود کا خاتمہ اسلام کے معاشی نظام کی طرف ایک ابتدائی قدم ضرور ہے لیکن یہ اس ضمن میں انتہائی قدم نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا معاشی نظام مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کا چربہ ہے اور دیکھا جائے تو پاکستان میں مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام ہی غالب ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء کرام اور پاکستان کی دینی قوتیں اس سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں اور اس کی بجائے اسلام کے معاشی نظام کی بحالی کے لیے

کوششیں کی جائیں اس کے لیے علماء کرام اور ایسے معاشی ماہرین کے مشترکہ کمیشن یا تھنک ٹینک کی ضرورت ہے جو اسلام کے معاشی نظام کے حامی ہوں۔ یہ کمیشن علمی اور فنی بنیادوں پر اسلام کے معاشی نظام کے لیے اقدامات تجویز کرے بلکہ مکمل لائحہ عمل پیش کرے اور اس پر عمل کی منصوبہ بندی بھی کرے۔ محض سود کے خلاف تقریریں، تحریریں اور تحریک چلانا شاید اتنا مفید اور کارآمد ثابت نہ ہو جب تک مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کو بحیثیت مجموعی چیلنج نہ کیا جائے اور اسلام کے معاشی نظام کو اس کے متبادل کے طور پر پیش نہ کیا جائے۔

سارے شعبوں میں اسلامی تعلیمات پر عمل

تیسرے یہ کہ اجتماعی زندگی ایک وحدت ہوتی ہے۔ ایک شعبے کا اثر لازماً دوسرے شعبوں پر پڑتا ہے مطلب یہ کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ پاکستان کے معاشی نظام کو تو اسلامی بنا دیا جائے لیکن تعلیمی نظام غیر اسلامی ہو، عدالتی نظام غیر اسلامی ہو، معاشرت اور میڈیا کا نظام غیر اسلامی ہو، لہٰذا ضروری ہے کہ زندگی کے سارے شعبۂ ہائے حیات کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالا جائے۔ اگر صرف معاشی نظام کو اسلامی تعلیمات پر استوار کیا جائے اور باقی شعبہ ہائے حیات اس کے برعکس کام کرتے رہیں تو اس کا زیادہ فائدہ نہ ہوگا۔

محض قانون سازی کافی نہیں

چوتھے یہ کہ وفاقی شرعی عدالت نے اپنے اس فیصلے میں حکومت پاکستان کو ایک ماہ کے اندر سودی قوانین کو بدلنے اور ان کی جگہ اسلامی قانون سازی کی ہدایت کی ہے جو خوش آئند ہے اور ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس آئینی ضرورت کو پورا کرتے ہوئے فی الفور متعلقہ قوانین کو مطابقِ اسلام بنائے۔ تاہم ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ پاکستان کے آئین میں بہت سی دفعات اسلامی ہیں اور اسی طرح بہت سے قوانین اسلامی ہیں لیکن ان پر عملدرآمد کوئی حکومت نہیں کرتی۔ مثلاً یہی دیکھیے کہ حدود قوانین پاکستان میں ۱۹۷۹ء سے نافذ العمل ہیں لیکن یہ کاغذوں ہی میں دفن ہیں اور پچھلے ۴۳ سال میں ایک بھی حد نافذ نہیں ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستانی معاشرہ لاقانونیت اور اخلاقی ابتری کی ساری سرحدیں پھلانگ رہا ہے۔ لہٰذا صرف سود کے خلاف قوانین پاس کر لینا اور اسلام کے حق میں قوانین بنا لینا کافی نہیں بلکہ ایسے افراد کی تیاری اور ایسے مائنڈ سیٹ کی تشکیل

وترویج بھی ضروری ہے جوان دینی احکام پر عمل کرنا تقاضائے ایمان سمجھتا ہو۔اس کے لیے ذہن سازی اور تعمیر سیرت کے سارے شعبوں کو خصوصاً تعلیم وتزکیہ اور میڈیا کو اس کام کے لیے متحرک اور فعال کرنا ضروری ہے تاکہ اسلامی فکروعمل کے حامل افراد تیار ہو سکیں جو معاشرے کی بھی اصلاح کریں اور ریاست کو بھی اسلامی تقاضوں کے مطابق چلانے میں کردار ادا کر سکیں۔

بقیہ: جامعات کی پی ایچ ڈی پر نظر

کیا ہی اچھا ہو اگر ہائر ایجوکیشن کمیشن تھیسس کی جانچ کے نظام کو متوازن بنانے کا کام جنگی بنیادوں پر کرے۔ کرونا کے باعث اب سیمینار اور کانفرنسیں آن لائن رواج پا چکی ہیں، لہٰذا ضروری قرار دیا جائے کہ شہر سے باہر کے ماہرین خود آنے کی "زحمت" نہ کریں بلکہ وہ آن لائن وائیوا میں شرکت کریں۔ مقالے کی جانچ کا کام کمیشن کی اپنے ماہرین کی نگرانی میں ہو۔ یہ کوئی ناقابل فہم تجویز نہیں۔ ایچ ای سی کے منظور شدہ سپروائزروں کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ تو اس کے ساتھ تھیسس کی جانچ پرکھ کے لئے ریٹائرڈ پروفیسروں سے کیوں کام نہ لیا جائے۔ یہ لوگ بڑی حد تک میرٹ پر کام کریں گے۔ اور متعلقہ صدر شعبہ کو مطلوب "تعاون" سے بھی گریز کریں گے۔

موجودہ صورت حال یہ ہے کہ پروفیسروں کی بڑی تعداد کو اپنی یونیورسٹی کے علاوہ ہر شہر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ آج پشاور میں وائیوا ہے، تو اگلے ہفتے آپ انہیں فیصل آباد میں دیکھیں گے۔ دو ہفتے بعد انہیں بہاولپور کسی کانفرنس میں دیکھا جائے گا۔ دس دن بعد وہ کراچی سیمنار میں مقالہ پڑھ رہے ہوں گے۔ پچھلے چند عشروں میں ان لوگوں کا یہ ایک کلب سا بن چکا ہے۔ یہ کلب باہمی مفادات کا اتنا اسیر ہو چکا ہے کہ ان کے فخر کے لئے یہ کافی ہوتا ہے کہ میں نے اتنے پی ایچ ڈی اسکالر تیار کیے۔ بلاشبہ یہ کام باعث اعزاز ہے لیکن انہی پروفیسروں کے نامہ اعمال پر تصنیف و تالیف اور اپنے تحقیقی کاموں جیسی علمی سرگرمیاں تلاش کی جائیں تو افسردگی ہوتی ہے۔

کرنے کے کام تو بلاشبہ بہت ہیں لیکن پی ایچ ڈی کرانے کے موجودہ طریق کار کی انقلابی جراحی ناگزیر ہو چکی ہے۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے چیئرمین جناب ڈاکٹر طارق بنوری سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ یہ کام ذرا ترجیحی بنیادوں پر کریں گے۔

اسلام اور پاکستان ڈاکٹر مفتی امیر حمزہ

بچوں کو اگلی صفوں سے مت نکالیے

مساجد میں یہ مکروہ حرکت نہ جانے کب سے شروع ہوئی ہے کہ امام صاحب کی نظر جونہی اگلی صفوں میں کسی بچے پر پڑتی ہے کرخت انداز میں اعلان ہوتا ہے کہ "بچوں کو پیچھے بھیج دیں"۔ اگر کبھی خوش قسمتی سے بچے پر امام صاحب کی نظر نہ پڑ سکے تو دائیں بائیں سے کوئی داروغہ بول پڑتا ہے۔بعض دفعہ تو ایسے مناظر بھی دیکھے ہیں کہ نماز کے آغاز میں بچہ بے چارا یہ دیکھتے ہوئے کہ سب نمازی کھڑے ہو چکے ہیں سہا ہوا صف کے کنارے پر جا کھڑا ہوتا ہے، پھر ہر آنے والا بچے کو ایک طرف کرتا جاتا ہے، صف مکمل ہو جائے تو بچے کو پچھلی صف میں دھکیل دیا جاتا ہے۔دوسری صف میں بھی یہی سلوک ہوتا ہے۔یوں پوری نماز میں بچہ "نیک" لوگوں کی اس "دست درازی" کا شکار رہتا ہے۔ یہ بہت گھٹیا حرکت ہے۔اس عمل سے نہ صرف بچے کی تربیت پر منفی اثرات پڑتے ہیں بلکہ مسجد کا وقار بھی متاثر ہوتا ہے۔

پورے دینی ذخیرے میں کہیں ایسی حدیث نہیں مل سکی جس میں حضور ﷺ کی طرف سے بچوں کو اگلی صفوں سے نکالنے کا اعلان کیا گیا ہو۔ہاں صحیح احادیث میں یہ ضرور ثابت ہے کہ پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر اول صف میں ہر کسی کا حق ہے۔اس کے عموم میں بچے بھی داخل ہیں۔

جن روایات سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچوں کو پچھلی صفوں میں ہونا چاہیے دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں ملتا ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں بچوں کی صفیں مردوں سے پیچھے ہوتی تھی۔ ایسی روایات اگر ثابت ہوں (یہ اس لیے کہ محققین نے انہیں ضعیف بتایا ہے) تو ان کا پس منظر یوں سمجھ میں آتا ہے کہ اس دور میں خواتین کے لیے مسجد میں الگ سے جگہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ایک ہی ہال میں صف بندی کے لیے مردوں اور عورتوں کی صفوں کے درمیان بطور فصل کے بچوں کی صف بندی کروادی جاتی تھی۔جب کہ آج کل اگر کسی مسجد میں خواتین کا انتظام ہو بھی تو ان کے

لیے الگ ہال یا جگہیں مختص ہوتی ہیں۔

دوسری قسم کی روایات وہ ہیں جن کے الفاظ یوں ہیں "لیلینی منکم اولوا الاحلام والنھی۔۔۔۔" یعنی نماز میں میرے پیچھے متصل عاقل بالغ لوگ ہونے چاہییں۔اس حدیث کا مطلب بھی محدثین نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یوں تو ہر کسی کو اگلی صفوں میں پہنچنے کا حق ہے مگر بڑوں کو چاہیے کہ پہلے پہنچ کر یہ فضیلت خود حاصل کریں۔بعض نے یہ بھی سمجھا ہے کہ امام کو بسا اوقات نیابت کی ضرورت پیش آسکتی ہے تو حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امام کے پیچھے ایسے لوگ ہوں جو امام بن سکیں یا بوقتِ ضرورت اصلاحِ قراءت یا نماز کے لیے لقمہ دے سکیں جو ظاہر ہے بچوں کے لیے ممکن نہیں۔اگر یہ بھی مراد ہو تو زیادہ سے زیادہ صفِ اول کا درمیانی حصہ (جو امام کے عین پیچھے ہوتا ہے) انتظامی طور پر اس مقصد کے لیے مخصوص کیا جاسکتا ہے۔یہاں سے بچے کو ہٹایا جاسکتا ہے۔سنن نسائی کی ایک روایت کے مطابق حضرت ابی بن کعبؓ نے ایک مرتبہ ایک بچے قیس بن عبادہ کو صفِ اول سے پیچھے کیا تھا، غالب گمان یہ ہے کہ وہ صف کے اسی حصے سے کیا ہوگا کیوں کہ اس کے بعد حضرت ابیؓ نے نمازیوں کو کچھ نصیحتیں فرمائی تھیں، وعظ وتذکیر کے لیے عموماً صفِ اول کے قلب کا انتخاب کیا جاتا ہے۔اس کے علاوہ ساری صفِ اول بلکہ اگلی تمام صفوں میں بچوں کے لیے کوئی الگ حکم نہیں۔

پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بچے اگر سرپرست کے ساتھ ہوں تو انہیں شرارتوں سے باز رکھا جاسکتا ہے۔بچوں کو اکٹھے کر دیا جائے تو مسجد میں شور وغل بڑھ جاتا ہے۔اس لیے بچوں کو مسجد میں اپنے ساتھ رکھیے۔اگر کوئی بچہ صفِ اول میں کھڑا ہونا چاہے تو اس کا دل مت توڑیے۔آپ یقین رکھیے بچے کی صفِ اول میں موجودگی سے آپ کے ثواب یا تقوے میں بالکل کمی نہیں ہوگی۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک پیٹھ پر دورانِ نماز بچے سوار ہوجایا کرتے تھے، آپ انہیں نہیں روکتے تھے، جبکہ ہم سے اس کی صفِ اول بھی برداشت نہیں ہوتی۔

اسلام اور پاکستان

پروفیسر محمد عاصم حفیظ[1]

رشتوں کو جوڑنے کی تحریک

چیف جسٹس (ر) کی انوکھی عدالت، اعلیٰ مشن اور 'آؤ صلح کرلیں' پراجیکٹ

دور حاضر کی مشینی زندگی، معاشی دوڑ، آلات سے لگاؤ اور اپنوں سے دوری، رشتوں کے تقدس واحترام میں کمی، باہمی برداشت اور صبر وتحمل کے فقدان، مغربی طرز زندگی، لبرل نظریات کے فروغ، خودمختاری کی خواہش اور کیریئر کی دوڑ جیسے بہت سے مسائل، رجحانات اور افکار نے آج کے خاندانی نظام کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ افراد تنہائی کا شکار ہو رہے ہیں۔ رشتے جڑنا مشکل ہو چکا ہے اور سب سے زیادہ رشتے ٹوٹنے کا رجحان خطرناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ ذرا سی ناگواری، چند لمحوں کا غصہ اور تھوڑی سے عدم دلچسپی، طبیعت کے خلاف کوئی بات یا جملہ، رشتہ توڑ دیتا ہے۔ طلاق تک نوبت پہنچتی ہے یا پھر ناراض ہو کر لمبی علیحدگی۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں رشتوں کو جوڑنے والوں کی تعداد کم ہو رہی ہے۔ ہر کوئی دوسرے سے لاتعلق رہنا چاہتا ہے جبکہ غلط مشوروں، جذباتیت اور جھوٹی انا کو لے کر رشتے توڑنے والے زیادہ ہیں اور تیزی سے بڑھ بھی رہے ہیں۔

ایسے میں جسٹس (ر) انوار الحق سابق چیف جسٹس لاہور ہائیکورٹ نے صلح کی منفرد شمع جلائی ہے۔ وہ نامور وکیل، پھر جج اور بطور چیف جسٹس ریٹائر ہوئے ہیں۔ برملا اظہار کرتے ہیں کہ خاندانی معاملات کو عدالت لے جانا حماقت ہے۔ وقت اور پیسے کا ضیاع، وکلاء کی فیسیں بھرتے جاؤ اور حاصل کچھ بھی نہیں۔ وہاں کوئی بھی مسئلے کو سلجھانے کی بات نہیں کرے گا بلکہ سب کی کوشش ہوگی کہ صلح نہ ہو، کیس لمبا چلے اور گلشن کا کاروبار چلتا رہے۔

انہوں نے قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن کے ساتھ مل کر 'آؤ صلح کریں' پراجیکٹ شروع کیا ہے۔ چیف جسٹس صاحب عدالت لگاتے ہیں لیکن ذرا مختلف قسم کی۔ جہاں قانون کا ہتھوڑا نہیں چلاتے بلکہ نصیحت اور نرم مزاجی سے صلح کی کوشش کرتے ہیں۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۸۲)

---

[1] گورنمنٹ ایم اے او کالج، لاہور

تفہیم مغرب	سید خالد جامعی

دنیا کی تباہی میں صرف تین برس رہ گئے

مغرب کی سائنس و ٹیکنالوجی نے دنیا کو تباہی سے دوچار کر دیا ہے

دنیا کی تباہی میں صرف تین برس رہ گئے ہیں، تیل و گیس کا استعمال 60 اور 70 فیصد کم کرنا ہوگا۔ اقوام متحدہ کے ادارے IPCC (Intergovernmental Panel on Climate Change) کے سربراہ کا بیان (جنگ کراچی 5 اپریل 2022)

آئی پی سی سی کے سربراہ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ترقی کی رفتار کو 60 سے 70 فیصد کم کرنا ہوگا کیونکہ ترقی تیل و گیس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ترقی کے عقیدے سے اعلان برأت نہیں ہوگا کچھ نہیں ہوسکتا۔

سٹیفن ہاکنگ نے اپنی موت سے ایک ماہ قبل ایک بیان میں کہا تھا کہ اس کرۂ ارضی کے خاتمے میں صرف ایک ہزار برس رہ گئے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی، جینیٹک انجینئرنگ اور جوہری توانائی نے اس دنیا کو تباہی کے قریب پہنچا دیا ہے لہٰذا اس کرہ ارض کی تباہی سے پہلے دنیا دوسرے کروں (Planets) میں جگہ تلاش کرے۔ اب اقوام متحدہ کے ادارے IPCC کے سربراہ کا بیان آیا ہے کہ دنیا تباہ کن گرمی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ تین سال سے بھی کم وقت رہ گیا ہے۔ کوئلہ جلانے کا عمل روکنا ہوگا۔ تیل کا استعمال 60 فیصد اور گیس کا استعمال 70 فیصد کم کرنا ہوگا۔ ماحولیاتی حدت کو صنعتی ترقی کے دور سے پہلے دور تک محدود کرنا ہوگا۔ حکومتیں اور کاروباری ادارے موسمیاتی تبدیلیوں کو روکنے کے لئے کوششیں کرنے کی بجائے جھوٹ بول رہے ہیں۔ IPCC کے سربراہ نے صاف لفظوں میں یہ نہیں کہا کہ ترقی کی رفتار روک دو کیونکہ ترقی مغرب کا عقیدہ ہے۔ عقیدہ کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا البتہ حالات کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

ہمیں حیرت ہے کہ جس وقت دنیا ترقی کی رفتار کو 70 فیصد تک روکنے کی کوشش کر رہی ہے اسی دور میں عالم اسلام کے مفکرین ترقی کو ایک اسلامی قدر کے طور پر عالم اسلام کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ترقی کی اسلام کاری (اسلامائزیشن) کے ذریعے ملت اسلامیہ کو پیغام دے رہے ہیں کہ وہ دنیا کی ترقی میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں کیونکہ ترقی سے سب کو، اسلام کو اور عالم انسانیت کو فائدہ پہنچے گا۔ سوال یہ ہے کہ کس کی بات مانی جائے اور کس کی بات پر اعتبار کیا جائے؟ ہمارے خیال میں اس سوال کا جواب بہت آسان اور بہت سادہ ہے، جب تک دنیا ترقی کے عقیدے پر ایمان سے دستبردار نہیں ہوگی تباہی آتی رہے گی۔

اسلام اور مغرب سید خالد جامعی

مغرب کے معاشرتی بحران کو ہم اپنے ہاں کیوں دعوت دے رہے ہیں؟

امریکہ اور یورپ میں شادی کا روایتی ادارہ ختم ہو رہا ہے

پاکستان میں مغرب زدہ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا پر فحاشی اور عریانی کی یلغار۔ مسلمان لڑکیوں کا گھر سے فرار۔ خلع کی کثرت۔ خاندان کے ادارے کی شکست و ریخت

* روس نے اینجلز کی کتاب *The Origin of Family* سے خاندانی نظام کے خاتمے کا سفر شروع کیا جو گورباچوف کے ہاتھوں پریسٹرائکا(Perestroika) پر آ کے ختم ہوا۔ گورباچوف نے کہا کہ ہمیں عورت کے اصل کردار کو زندہ کرنا ہے۔ ہمارا گھر خاندان سب بکھر رہے ہیں۔

* آزادی، ترقی اور نوکری کا انجام: خاندان تباہ

* امریکہ اور یورپ میں شادی کا روایتی ادارہ ختم ہو رہا ہے

* امریکہ کے بارے میں نیو یارک ٹائمز اور National Center for Health Statistics کے ہولناک اعداد وشمار۔ نیو یارک ٹائمز کی رپورٹ کہ ملک میں شادی کرنے والے لوگ جلد اقلیت میں بدل جائیں گے۔

* امریکہ میں مارکیٹ اکانومی اور مارکیٹ سوسائٹی تباہی لا رہی ہے۔ اس کے لیے سانڈل کی کتاب *What Money can't Buy?* کا چوتھا باب Life & Death Markets پڑھیے۔

گورباچوف جیسے ملحد کو تسلیم کرنا پڑا کہ نوکری کرنے والی عورت اپنی اصل ذمہ داری گھر داری کو نہیں نباہ سکتی لہٰذا عورت کو اصل فرائض ادا کرنے کے لیے مختص کرنا اہم ہے۔ کیا افغان طالبان گورباچوف کے روس سے سبق سیکھ سکتے ہیں جسے انہوں نے شکست دی تھی۔ اب مغرب اور روس عورت کے ذریعے طالبان کو شکست دے رہے ہیں۔ دنیا بھر کو عسکری میدان میں شکست دینے والے طالبان کو عورت کے مسئلے پر مغرب سے مصالحت کر کے تہذیبی شکست برداشت نہیں کرنی چاہیے۔

نیو یارک ٹائمز نے امریکہ میں شادی کے ادارے کے خاتمے سے متعلق نہایت ہولناک رپوٹ شائع ہے۔

C.M, Blow, The Married will soon be the Minority
New York Times Oct 22, 2121۔مصنف کی تحقیق کے مطابق ۱۹۷۰ء میں امریکہ میں ۲۵ سے ۵۰ سال کے درمیان مردوں اور عورتوں میں ۹ فیصد لوگ ایسے تھے جنہوں نے کبھی شادی نہیں کی اور وہ تجرد کی زندگی گزار رہے تھے۔ ۱۹۹۰ء میں مجرد (Unmarried) لوگوں کی تعداد ۲۰ فی صد تک پہنچ گئی۔ مصنف PEW ریسرچ سنٹر کی تازہ رپورٹ کا حوالے دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۲۰۱۹ء میں غیر شادی شدہ امریکیوں کی تعداد ۳۸ فی صد تک پہنچ گئی۔ ان میں وہ مرد وعورت بھی شامل ہیں جو بغیر نکاح کے بھی اکٹھے نہیں رہ رہے جنہیں امریکہ میں Partners کہتے ہیں۔

۲۰۱۸ء میں امریکہ میں شادیوں کی تعداد سب سے کم رہی۔ سوچا جا رہا ہے کہ مجرد زندگی بسر کرنے والوں پر تنہائی ٹیکس (Loner Tax) لگایا جائے۔ مجرد رہنے کے اس رجحان (Institutionallized Singlism) کو ختم کرنے کے لیے کئی اقدامات پر غور کیا جا رہا ہے جیسے یہ کہ لوگوں کو شادی پر آمادہ کرنے کے لیے پرکشش مالی فوائد دیئے جائیں، ٹیکس میں کمی کی جائے اور بچوں کے اخراجات اٹھانے کے لیے ریاست امدادی پروگرام شروع کرے۔

ایک زمانہ تھا کہ امریکہ اور تمام دنیا میں غیر شادی شدہ رہنے والے مرد، عورت کو معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ معاشرت میں ایسے فرد کی عزت بہت کم ہوتی تھی اور اسے بیمار، نفسیاتی، لوگوں سے متوحش، غیر متوازن اور مجنوں سمجھا جاتا تھا۔ شادی جو کبھی امریکی معاشرے میں ایک اعلیٰ، معیاری، مثالی کام تھا اب اپنی مثالیت کھو چکی ہے۔ یہ سب کچھ آزادی، مساوات اور ترقی کے عقیدے کا اثر ہے۔ مساوات، عیاشی، زنا کاری اور طلاق روکنے کے لیے بنائے گئے سخت اور غیر فطری قوانین نے شادی کے ادارے کو تباہ کیا۔ آزادی کی تلاش میں ہم جنس پرستی کا سیلاب آ گیا۔ مہنگائی نے بھی شادی کے ادارے کو زبردست نقصان پہنچایا۔ مارکیٹ کی جانب سے مسلط کردہ مصنوعی مگر عالیشان معیار زندگی کے خواب دیکھ دیکھ کر مرد عورت خود کو محروم تصور کرنے لگے کہ وہ ایسی مثالی زندگی نہیں گزار سکتے تو شادی کا کیا فائدہ؟ نکاحی زنا (Marital Rape) کے قوانین نے بھی رنگ دکھایا۔ نکاحی زنا کا مطلب یہ ہے کہ خاوند، بیوی کی مرضی کے بغیر اس سے مباشرت کرے تو یہ جرم ہے۔ طلاق دینے پر مرد کی آدھی جائیداد کا خاتمہ شادی کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔ گھریلو تشدد کے قانون (Domestic Violence Act) نے بھی شادی کے ادارے

کو بے پناہ نقصان پہنچایا۔ مردعورت آزادی کے عقیدے کی پرستش میں اپنی ذمہ داریاں اٹھانے اور نبھانے کی بجائے انہیں ایک دوسرے پر ڈالنے لگے یا اداروں کے سپرد کرنے لگے لہٰذا شادی بہت بڑا مسئلہ بن گئی۔ زندگی گزارنے کے لیے شادی حل (Solution) نہیں مسئلہ (Problem) بن گئی بلکہ بنادی گئی۔

مہنگائی اور معیارزندگی میں اضافے کے باعث عام آدمی کے لیے ممکن نہیں رہا کہ وہ خاندان کی ذمہ داریاں اٹھاسکے۔ تنہائی میں عیش ممکن ہے لیکن بیوی بچوں کے ساتھ مسائل کا جیش آتا ہے اور غربت گھر میں طیش کی ثقافت لاتی ہے۔ اس سے بچنے کا سیدھا سادہ طریقہ یہ ہے کہ شادی نہ کرو۔ غیر اخلاقی جنسی معاملات رکھو۔ آزادی سے زندگی گزارو۔ اگر بچے چاہئیں تو شادی کے بغیر عورت کا رحم (Womb) خریدلو۔ بھارت یا کولمبو جا کر کرائے کی ماں (Surrogate Mother) کی کوکھ میں اپنے بچے دولت دے کر پیدا کرلو۔ جنسی خواہشات پوری کرنے کے لیے مصنوعی آلات سے مدد لو۔ غیر فطری جنسی اعمال میں مصروف رہو تاکہ خاندان بنانے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ شادی ذمہ داریوں کا جنجال اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اس سے بچ کر گزر جاؤ۔

ظاہر ہے یہ نقطۂ نظر بالکل غلط ہے لیکن مغرب کا آزادی کا عقیدہ جہاں گیا اس نے اقدار بدل ڈالیں۔ امریکہ میں اب لوگ شادی کرنے کو ضروری نہیں سمجھتے اور نہ مجرد رہنے کو برا سمجھتے ہیں۔

روس نے سرخ انقلاب کے بعد اینجلز کی کتاب *Origion of Family* کی روشنی میں خاندان کے ادارے اور شادی کو ایک مذہبی اور بورژوائی فعل قرار دے کر خاندان کا ادارہ تباہ کردیا۔ اینجلز نے لکھا کہ اگر حق وارثت اور ذاتی ملکیت کا خاتمہ کردیا جائے اور عورت کو معاشی حیثیت سے مرد کے برابر کردیا جائے تو پھر خاندانی نظام اور گھر کو قائم رکھنے کی کوئی اقتصادی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مردعورت کے ملاپ سے پیدا ہونے والے بچوں کو ریاست پال لے گی یعنی خاندان بس ایک معاشی ادارہ ہے اخلاقی، روحانی، ایمانی ادارہ نہیں۔

اینجلز نے لکھا کہ عورت اور مرد کے درمیان تعلق کا واحد محرک شہوت اور جنسی جذبات ہیں لہٰذا یہ تعلق اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک یہ جذبات قائم رہیں۔ جب یہ جذبات سرد پڑ جائیں تو دونوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ ہوجانا چاہیے۔ روس کے قوانین ازدواج ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۷ء کے مطابق تمام بچے ریاست کی ملکیت ہوگئے اور مذہب کے تحت کیے گئے تمام نکاح

ناجائز قرار پائے۔لیکن ۱۹۳۶ء میں نکاح کے ادارے کو بحال کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔نئے قوانین آئے،خاندان کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی۔وہ بحال تو ہوا لیکن بہت سے رخنے،مسائل اور مشکلات پیدا ہوگئیں۔متحدہ روس کے صدر گوباچوف نے اپنی کتاب پریسٹرائیکا (Prestroika) میں صفحہ ۱۱۷ پر Women & the Family کے عنوان سے جو لکھا وہ مغرب اور متجددین کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔عالم اسلام میں خاندان کو توڑنے،عورت کو مرد کے شانہ بہ شانہ لانے،اسلامی علمیت کے ذریعے عورت کو مرد کے برابر کھڑا کرنے کے جو تجربات ہو رہے ہیں،ان تجربات کو کرنے سے پہلے گورباچوف کے خیالات پڑھ لینے چاہئیں۔

افغانستان کے طالبان عورت کو پبلک لائف میں لانے کا سوچ رہے ہیں۔وہ بھی روس کے تجربے کو غور سے پڑھ لیں۔اگر طالبان صرف عورت کو گھر سے باہر لانے کی حوصلہ افزائی کریں گے تو اسلام افغانستان میں اجنبی بن جائے گا۔اسی لیے مغرب کا تمام زور عورت کی آزادی پر ہے۔عورت جیسے ہی آزاد (Liberal) ہوگی اسلام، خاندان ،اخلاقیات ،شرم وحیاء سب رخصت ہو جائیں گے۔

ہم امریکہ کے ان مردوں اور عورتوں کے بارے میں بات کر رہے ہیں جو تجرد کی زندگی اس طرح گزار رہے ہیں کہ ان کا کوئی ناجائز رفیق ان کے ساتھ نہیں رہ رہا وہ بالکل مجرد ہیں گویا ان میں اپنی جنس مخالف (Oppostie Sex) سے توحش پایا جاتا ہے۔یہ توحش آزادی (Freedom) کے عقیدے کا نتیجہ ہے جس کا ماخذ انسانی خود مختاری (Self Autonomous being) کا تصور ہے جس نے انسان کو آزاد وجود بتایا۔ایسا وجود جو مجرد وجود (Abstract) ہے جو کسی تعلق (Relation) یا رشتوں کی زنجیر (Chain of relations) میں بندھا ہوا نہیں ہے۔وہ کسی کو جواب دہ نہیں،اس پر کسی کی حاکمیت قائم نہیں،صرف نفس اس کا حاکم ہے،وہ تمام فیصلے اپنی عقل یا ریاست کے قوانین کے تابع کرتا ہے۔ریاست اور اپنے آپ کے سوا وہ کسی کو اپنی زندگی کے فیصلوں میں داخل یا شامل ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔وہ سب سے پہلے اپنی ریاست،اس کے بعد اپنے نفس کا عبد ہے اور انہی دونوں کو جواب دہ ہے۔وہ اللہ کے احکام کو ماننے کا پابند نہیں البتہ ریاست کے احکامات کو ماننے کا پابند ہے۔دوسرے معنوں میں وہ اپنے نفس اور ریاست کو نعوذ باللہ خدا کا درجہ دے چکا ہے۔

پاکستانیات ادارہ

گلوبل وارمنگ کے پاکستان پر اثرات

شدید گرمی اور پانی کی قلت۔ہم کب سوچیں گے؟

گرمی کی تازہ لہر نے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔لیکن اس لہر اور اس کے خطرناک اثرات پر بحث، تحقیق اور گفتگو برطانیہ اور امریکہ میں ہو رہی ہے۔ امپیریل کالج لندن اور یونیورسٹی آف ہوائی میں محققین بیٹھے سوچ رہے ہیں کہ موسم کی یہ انگڑائی پاکستان کا کیا حشر کر سکتی ہے لیکن پاکستان کے کسی ادارے اور یونیورسٹی کے لیے یہ سرے سے کوئی موضوع ہی نہیں ہے۔سوئٹزرلینڈ میں بیٹھا ڈاکٹر رابرٹ روڈ دہائی دے رہا ہے کہ موسموں کے اس آتش فشاں کو سنجیدگی سے لیجیے ورنہ ہزاروں لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے لیکن پاکستان کے اہل دانش سیاست کی دلدل میں غرق ہوئے پڑے ہیں۔

ندی خشک پڑی ہے اور چشمے کا پانی نڈھال ہے۔مارگلہ کے جنگل میں آج درجہ حرارت 42 کو چھو رہا ہے۔عید پر بارش ہوئی تو درجہ حرارت 22 تک آ گیا تھا لیکن عید سے پہلے اپریل کے آخری دنوں میں بھی یہ 40 سے تجاوز کر گیا تھا۔ مارگلہ میں چیت اور وساکھ کے دنوں میں ایسی گرمی کبھی نہیں پڑی۔ یہ جیٹھ ہاڑ کا درجہ حرارت ہے جو چیت اور وساکھ میں آ گیا ہے۔موسموں کی یہ تبدیلی بہت خطرناک ہے لیکن یہاں کسی کو پروا نہیں۔اس معاشرے اور اس کے اہل فکر و دانش کو سیاست لاحق ہو چکی اور ان کے لیے سیاست کے علاوہ کسی موضوع پر بات کرنا ممکن نہیں رہا۔

موسموں کی اس تبدیلی سے صرف مارگلہ متاثر نہیں ہوگا، پورے ملک پر اس کے اثرات پڑیں گے۔ مارگلہ میں تو درجنوں چشمے ہیں اور ندیاں۔ کچھ رواں رہتی ہیں کچھ موسموں کے ساتھ سوکھتی اور بہتی ہیں لیکن جنگل کے پرندوں اور جانوروں کے لیے یہ کافی ہیں۔سوال تو انسان کا ہے، انسان کا کیا بنے گا؟ افسوس کہ انسان کے پاس اس سوال پر غور کرنے کا وقت نہیں۔

پاکستان ایک زرعی ملک ہے لیکن ماحولیات کی تباہی سے یکسر بے نیاز۔گلی کوچوں سے پارلیمان تک یہ سوال کہیں زیر بحث ہی نہیں کہ درجہ حرارت بڑھنے کا مطلب کیا ہے؟ زیر زمین پانی کی سطح جس تیزی سے گر رہی ہے، خوفناک ہے۔ چند سال پہلے اسلام آباد میں 70 یا 80 فٹ پر پانی مل جاتا تھا لیکن اب تین سے چار سو فٹ گہرے بور کرائیں تو بمشکل اتنا پانی دستیاب ہوتا ہے کہ پانچ سے دس منٹ موٹر چل سکتی ہے۔موسم کی حدت کا عالم یہی رہا تو پانچ دس سال بعد زیر

زمین پانی چھ سات سو فٹ گہرائی میں بھی مل جائے تو غنیمت ہوگا۔

اسلام آباد دارالحکومت ہے لیکن پانی کا بحران اسے لپیٹ میں لے چکا ہے۔ ایک ٹینکر اب دو ہزار کا ملتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ ٹینکر بھی تو کنوؤں سے پانی بھر کر لاتے ہیں۔ زیرزمین پانی کی سطح یونہی نیچے جاتی رہی تو ٹینکرز کہاں سے پانی لائیں گے؟ ایک آدھ سیکٹر کو چھوڑ کر سارا شہر اس مصیبت سے دوچار ہے لیکن اپنا کمال دیکھیے کہ شہر میں کسی محفل کا یہ موضوع نہیں ہے۔ نہ اہل سیاست کا، نہ اہل مذہب کا نہ اہل صحافت کا۔ سب مزے میں ہیں۔

یہ بحران صرف اسلام آباد کا نہیں، پورے ملک کا ہے۔ بس یہ ہے کہ کسی کی باری آج آرہی ہے کسی کی کل آئے گی۔ جب فصلوں کے لیے پانی نہیں ہوگا اور فوڈ سیکیورٹی کے مسائل کھڑے ہو جائیں گے، پھر پتا چلے گا کہ آتش فشاں پر بیٹھ کر بغلیں بجانے والوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

جنگل کٹ رہے ہیں، درجہ حرارت بڑھ رہا ہے، سمندر کی سطح بلند ہو رہی ہے (یعنی کراچی کے سر پر خطرہ منڈلا رہا ہے)، گلیشیئر پگھل رہے ہیں اور سیلابوں کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں۔ ابھی گلگت بلتستان میں گلیشیئر کے پگھلنے سے حسن آباد پل تباہ ہوا ہے۔ کئی گھر اس کی لپیٹ میں آئے ہیں۔ خود اس پل کی تزویراتی اہمیت تھی کہ یہ چین اور پاکستان کو ملا رہا تھا۔ پل کی تزویراتی اہمیت کی نسبت سے یہ حادثہ ہمارے ہاں زیر بحث آ جائے تو وہ الگ بات ہے لیکن ماحولیاتی چیلنج کی سنگینی کو ہم آج بھی سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اخبارات، ٹی وی چینلز، سوشل میڈیا، پریس ٹاک، جلسہ عام.... کہیں اس موضوع پر کوئی بات ہوئی ہو تو بتایئے۔

مارگلہ کی ندیاں بھی اجنبی ہوتی جا رہی ہیں۔ ابھی چند سال پہلے درہ جنگلاں کی ندی ساون بھادوں میں یوں رواں ہوئی کہ چار ماہ جوبن سے بہتی رہی۔ اب دو سال سے خشک پڑی ہے۔ ساون اس طرح برسا ہی نہیں کہ ندی رواں ہوتی۔ رملی کی ندی بہہ تو رہی ہے مگر برائے نام۔ جب پوش سیکٹروں کا سیوریج ان ندیوں میں ملا دیا جائے گا تو ندیاں شاید ایسے ہی ناراض ہو جاتی ہیں۔ اب تو یوں لگتا ہے نظام فطرت ہی ہم سے خفا ہو گیا ہے۔ موسم ہم سے روٹھتے جا رہے ہیں۔

[چولستان میں پانی عنقا ہے۔ جانور پیاسے مر رہے ہیں، انسانوں کی پیاس بجھانے کے لیے پانی موجود نہیں۔ گرمی کی لہر (Heat wave) سے سیکڑوں اموات ہو چکی ہیں لیکن گلوبل وارمنگ کے اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے پاکستان میں کسی سطح پر کوئی سرگرمی نہیں۔]

ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ماحولیات سے جڑے چیلنجز کی سنجیدگی کو سمجھا نہ گیا تو بہت بڑا اور خوفناک بحران ہماری دہلیز پر دستک دینے والا ہے۔

فہم دین

مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ

معیشت واخلاق کا باہمی تعلق

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی نظر میں (۱)

جدید وقدیم فلاسفہ اور حکماء نے فلسفہ وحکمت کی جو تعریفیں کی ہیں ان کا خلاصہ اور نچوڑ اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ "حکمت نام ہے قول وعمل میں درست کاری اور حق وراستی کی معرفت کا۔ پس اگر معرفت اور درست کاری اشیاء کے پوشیدہ اسرار اور اسباب کے باہمی تعلق وارتباط سے آگاہ کرتی ہے تو اس کو حکمتِ علمیہ کہتے ہیں"۔

اس پوری حقیقت کو قرآن عزیز نے اپنے معجزانہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَآءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ﴾

[البقرہ۲:۲۶۹]

"جس شخص کو حکمت سے حصہ دیا گیا بلاشبہ اس کو زبردست بھلائی دی گئی اور بہت بڑا کمال بخشا گیا۔"

اور اگر مذکورہ بالا معرفت اور آگاہی رموزِ قدرت کے مطابق ہر شے کو اس کے مناسب جگہ دے تو اس کو 'حکمتِ عملی' کہا جاتا ہے (۲)

حکمت کی عظمت

حکمت اپنے اندر کیسے عظیم الشان کمالات رکھتی ہے اور حیات انسانی کے ارتقاء میں اس کا درجہ کس قدر بلند اور پر عظمت ہے؟ اس کا اندازہ جدید اور قدیم علمی کاوشوں کے اس ذخیرہ سے ہو سکتا ہے جو علمی نظریوں اور عملی سائنس کے ذریعہ ہماری مادی زندگی کی ترقی اور سربلندی کی بیش بہا خدمات انجام دیتا رہا اور دے رہا ہے۔ نیز ہماری روحانی نشوونما اور کمالات کے ارتقاء کا ضامن

---

(۱) 'الفرقان'، شاہ ولی اللہ نمبر ۱۹۴۱ء

(۲) مدارج السالکین، ج ۲، ص ۴۴۴،

اور کفیل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خالق علوم نے اپنی ذات کے ساتھ اس کس کمال کو متصف ظاہر کیا ہے:

﴿إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝﴾ [البقرہ ٢:٣٢]

بلاشبہ تو ہی علم والا، حکمت والا ہے[١] (یعنی سرچشمہ علم وحکمت ہو)

حکمت اور علم الاسرار

یہی حکمت جب ''قوانین الٰہی'' (شریعت حقہ) کے رازہائے سربستہ اور حقائق ورموز سے آگاہی میں استعمال کی جاتی ہے تو اس کا نام ''علم الاسرار'' ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ بتائے کہ دین ومذہب کے قوانین واصول کس طرح عقل وفطرت (نیچر) سے مطابقت رکھتے ہیں اور کس طرح کائنات کے انفرادی واجتماعی نظام کے لیے باعث فلاح وسعادت ہیں۔

حکیم الامہ کا نظریۂ اخلاق

شاہ ولی اللہ بہت سی پرعظمت کتابوں کے مصنف ہیں جو مختلف علوم وفنون کا نادر ذخیرہ ہیں، مگر ان کی تصنیفی زندگی کا شاہکار ''حجۃ اللہ البالغۃ'' ہے۔ یہ کتاب علومِ عقلیہ ونقلیہ کا بیش بہا گوہر اور انمول موتی ہے۔ ''علم اسرار'' و''حکمت ربانی'' کے پیش نظر شاہ صاحب نے اس میں وہ سب کچھ سپرد قلم کر دیا ہے جو انسانی سعادت کے انفرادی واجتماعی دونوں پہلوؤں اور دنیوی واخروی دونوں زندگیوں سے متعلق ہے۔

اس کتاب کا ایک حصہ ''علم الاخلاق'' سے متعلق ہے جس میں اخلاق کے علمی نظریوں اور عملی درست کاریوں کو بہترین طرز نگارش کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔

دوسری کتابوں میں جب آپ ''علم الاخلاق'' کے ان مباحث کا مطالعہ کریں گے جن میں ''علم الاخلاق کا دوسرے علوم سے تعلق'' پر بحث کی گئی ہے تو تمام علماء اخلاق اور حکماء وفلاسفہ کو اس پر متفق پائیں گے کہ وہ اس سلسلہ میں علم مابعد الطبیعہ (میٹافزیکس)، فلسفۂ طبیعی (فزکس)، علم الارتقاء (ایوولیوشن)، علم النفس (سائیکالوجی)، علم المنطق (لاجک)، حیاتیات (بایولوجی)،

---

[١] اخلاق جلالی، ص: ٢٦

فلسفہ قانون (فلاسفی آف لاء)، علم الاجتماع (سوشیالوجی) اور فلسفہ تاریخ (فلاسفی آف ہسٹری) کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن کسی ایک جگہ بھی یہ اشارہ نہیں کرتے کہ "علم اخلاق" کا کوئی تعلق اجتماعی علم المعیشت سے بھی ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کس طرح کا ہے؟

ارسطو کی کتاب الاخلاق، فلسفۂ اخلاق میں ابن مسکویہ کی کتاب السعادۃ اور تہذیب الاخلاق اور اسی کی "ادب الدنیا والدین، غزالی کی احیاء العلوم، راغب کی الذریعہ، ابن قیم کی مدارج السالکین اور اسی قسم کی دوسری اخلاقی کتابوں میں کسی جگہ اس کا ذکر نہیں ملتا۔ مشہور حکماء وفلاسفہ اور علماء اخلاق کے تمام مباحث اخلاق کو غور وخوض سے مطالعہ کرنے کے باوجود اس سلسلہ میں ناکامی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ چنانچہ قدیم علماء وحکما مثلاً ارسطو، افلاطون، سقراط، منکہ ہندی، رواقی، ابیقورین، کندی، فارابی، ابی سینا، غزالی، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، ابن خلدون، ابن ہیثم، ابن عربی، ابن مسکویہ، اور اخوان الصفاء کے بیان کردہ "اخلاقی نظریئے" جس طرح اس مسئلہ میں تہی دامن ہیں اسی طرح جدید علماء اخلاق "مثلاً کانٹ، اسپنسر، شوپنہار، دیکاٹ فرنساوی، منتھم اور جون اسٹویرٹ مل، اسپنوزا، جرین، ہیگل کے حکمت وفلسفہ کے تمام اخلاقی نظریے بھی اس سوال کے جواب میں خاموش نظر آتے ہیں۔

حالانکہ جرمن فلاسفر آگست کسٹ اور کانٹ اور انگریز فلاسفر ہربرٹ اسپنسر تو ان مشاہیر فلاسفروں میں سے ہیں جنہوں نے "علم الاخلاق" کے ساتھ "علم الاجتماع اور علم الارتقاء کو منطبق کرنے کے لیے بہت سے جدید اور وسیع نظریوں سے کام لیا ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کی بھی پرواز خیال اس رفعت وبلندی تک نہ پہنچ سکی جو "شاہ ولی اللہ دہلوی" کے حصہ میں آئی۔

متاخرین علماء اخلاق، عارف رومی، سعدی، اور شیخ سرہندی نے اخلاقیات پر بہت کچھ کہا اور خوب کہا لیکن دنیا کے اجتماعی اخلاق کی برتری یا بربادی پر جو چیز سب سے زیادہ اثرانداز ہوتی ہے اور ہوتی رہی ہے یعنی "اجتماعی اقتصادیات" اس کا نشان یہاں بھی نہیں ملتا۔

غرض "شاہ ولی اللہ دہلوی" کی مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" وہ پہلی کتاب ہے جس نے ہم کو اس بیش قیمت علمی نظریہ سے روشناس کرایا کہ اجتماعی علم اخلاق کی فلاح وسعادت اجتماعی

معاشیات کے عادلانہ نظام پر موقوف ہے۔اور یہ کہ دنیا کی قوموں کا اجتماعی اخلاق اس وقت تک صحیح اور بہتر نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان کے درمیان ایک ایسا اجتماعی ،اقتصادی نظام قائم نہ ہو جائے جوافراط وتفریط سے پاک عادلانہ اصول رکھتا ہو۔

امام الحکمۃ شاہ ولی اللہ کے علاوہ تمام علماء اخلاق ،جدید ہوں کہ قدیم، یہ سمجھتے رہے ہیں کہ قوموں کے اجتماعی اخلاق کو''حسین'' بنانے کے لیے عمدہ اخلاقی نظریوں کے غازہ کی ضرورت ہے اس لیے انہوں نے جدید علم الاخلاق کو علم الاجتماع پر منطبق کرنے کی زبردست کوشش کی ہے مگران تمام علماء سے جدا شاہ ولی اللہ دہلوی نے یہ دعویٰ کیا کہ ''اجتماعی اخلاق'' کا حسن اس وقت تک نہیں نکھر سکتا جب تک کہ اقوام کے اجتماعی جسم کو فاسد معاشی نظام کے جذام سے صحت حاصل نہ ہوجائے،اگر یہ ہوجائے تو پھر اجتماعی اخلاقیات کا تازہ خون خود بخود جسم اقوام میں دوڑنے لگے گا اوراس کے حسن وزیبائش کے لیے کسی خارجی پاؤڈر اور غازہ کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اجمال کی تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ علماء اخلاق کے نزدیک یہ تسلیم شدہ مسئلہ ہے کہ علم اخلاق کا علم الاجتماع کے ساتھ گہرا تعلق ہے اور وہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں:

''انسان کی زندگی اجتماعی زندگی کے بغیر ناممکن ہے اور وہ ہمیشہ کسی نہ کسی جماعت کا فرد ہوکر ہی زندہ رہ سکتا ہے اور یہ ہماری قدرت سے باہر ہے کہ ہم کسی ایک فرد کے فضائل سے اس طرح بحث کریں کہ جس جماعت کی جانب وہ منسوب ہے اس سے بالکل قطع نظر کرلیں اس لیے کہ اس کے بغیر ہم یہ کیسے جان سکتے ہیں کہ جس جماعت سے اس کا تعلق ہے اس کے اندر وہ کون سے اوصاف ہیں جن سے فضائل ومحاسن اخلاق میں مدد ملتی یا رکاوٹ پیدا ہوتی ہے؟''[۱]

حقیقت حال یہ ہے کہ انسان نہ صرف کسی ایک بلکہ بہت سے روابط کے ساتھ ناگزیر طور پر مربوط ہے اوراس طرح وہ اپنے کنبہ کا بھی عضو ہے،قریہ کا بھی،قوم کا بھی فرد ہے اور پھر تمام انسانی

---

[۱] اخلاق وفلسفہ اخلاق،ص ۱۱

دنیا کا بھی۔''[۱]

ان حقائق کے پیش نظر انفرادی اخلاق کا تعلق علم الاجتماع کے ساتھ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے[۲]

اور شاہ ولی اللہؒ نے خصوصیت کے ساتھ ''مبحث ارتفاقات'' کے عنوان سے اس مسئلہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔[۳]

پس اس ''مسلمہ'' عقیدے نے ''انفرادی اخلاق'' کے مقابلہ میں ''اجتماعی اخلاق'' کی برتری پر مہر تصدیق ثبت کردی اور یہ واضح کردیا کہ حیات انسانی میں اجتماعی اخلاق کی قیمت بہت زیادہ ہے کیونکہ اس کی افادیت بہت زیادہ ہے۔

لیکن ''علماء واخلاق'' میں یہ اختلافی مسئلہ ہے کہ ''اجتماعی اخلاق'' میں سے کس خلق کو شرف اور برتری حاصل ہے، کتب اخلاق میں اس بحث کو ''فضیلت'' کے باب میں بیان کیا جاتا ہے اور اس میں سقراط، ارسطو، فلاطون، ابن مسکویہ، اور دورِ حاضر کے علماء اخلاق کے مباحث کو تفصیل سے نقل کیا گیا ہے۔ان مباحث کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سقراط ہر شے کی صحیح معرفت کو سب سے بڑی فضیلت تسلیم کرتا ہے، ارسطو نظریہ ''اوساط'' کا قائل ہے۔افلاطون کبھی اپنے استاد سقراط کی تقلید کرتا نظر آتا ہے اور کبھی خواہشات نفس پر ''ضبط اور کنٹرول'' کو سب سے بڑی فضیلت شمار کرتا ہے۔

ابن مسکویہ ارسطو کی تائید میں مصروف ہے اور دور حاضر کے علماء فضائل اجتماعیہ کو بغیر کسی برتری اور فضیلت کے مختلف اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن ولی اللہ دہلوی نے اصول اخلاق کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ''اجتماعی اخلاق'' کے لیے صرف ایک ہی فضیلت کو ''اصل'' اور ''معیار'' قرار دیا ہے۔اور وہ ''عدل'' ہے۔چنانچہ فرماتے ہیں:

''عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب انسانی اطوار زندگی مثلاً نشست وبرخاست

---

[۱] ایضاً

[۲] مختصر از اخلاق وفلسفہ اخلاق، ص ۲۲۵ تا ۲۲۷

[۳] حجۃ اللہ، ج۱، ص ۳۸، ۳۹

خواب و بیداری، رفتار و گفتار اور شکل ولباس وغیرہ میں اس کا لحاظ کیا جائے تو اس کو "ادب" کہتے ہیں اور جب مالی حیثیت یعنی جمع وخرچ سے متعلق امور میں اس کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نام "کفایت" ہے اور اگر تدبیر منزل میں اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ آزادی (سول لبرٹی) کہلاتی ہے اور اگر تدبیر مملکت میں اس کو بنیاد بنایا جائے تو اس کو "سیاست" کہا جاتا ہے اور اگر اس کو باہمی اخوت ومحبت اور تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اسی "عدل" کو حسن معاشرت کا نام دیا جاتا ہے۔"[۱]

اجتماعی اخلاق میں "عدل" کی حیثیت کو جس طرح شاہ صاحب نے ظاہر فرمایا ہے "علماء اخلاق" کے لیے یہ ایک بہترین نظریہ ہے جو "فضیلت" سے متعلق قدیم وجدید تمام مباحث کے اختلاف کے لیے ایک "محاکمہ" اور فیصلہ کن مسئلہ کی طاقت رکھتا ہے اور اس سے اجتماعی اخلاق میں "عدل" کی برتری کے ساتھ ساتھ وہ تمام مشکلیں بھی حل ہو جاتی ہیں جو "فضیلت" کی بحث میں علماء اخلاق کے سامنے رونما ہیں۔

عدل کا تعلق نظام انسانی سے

"شاہ ولی اللہ" اجتماعی اخلاق میں "عدل" کو یہ حیثیت کیوں دیتے ہیں؟ اس کا جواب خود انہوں نے "عدالت" کی تعریف کرتے ہوئے دیا ہے۔ حجۃ اللہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"عدالت ایک ایسے ملکہ کا نام ہے جس کے ذریعہ سے تدبیرِ منزل، سیاستِ مملکت اور اسی قسم کے اجتماعی معاملات کے لیے سہولت اور آسانی کے ساتھ خیر کا نظام قائم ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ ایک ایسی نفسیاتی کیفیت کا نام ہے جس سے ایسے لطیف افکار علیہ اور سیاسیات عالیہ پھوٹتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے عالم روحانیات کے نزدیک ٹھیک اور مناسب ہوں۔"[۲]

اور فیوض الحرمین میں خلق حسن "سمتِ صالح" کی بحث میں تحریر فرماتے ہیں:

"اخلاق انسانی میں ایک خلق کا نام "سمت حسن" (نیک سرشت) ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے نفس ناطقہ ان اعمال واخلاق میں بیداری اور توجہ کامل حاصل کر لیتا ہے جو

---

[۱] حجۃ اللہ، ج۱، ص۲۹

[۲] حجۃ اللہ، ج۲، ص۶۸، ۶۹

اس کے اور خدا کے درمیان اور اس کے اور خدا کی تمام مخلوق کے درمیان وابستہ ہیں اور ایسے ''نظام صالح'' کی جانب راہ پاجاتا ہے جو رضا الٰہی کا منشا ہے۔

سو جب اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی بھلائی چاہتا ہے تو اس کو ان اعمال و اخلاق کی سمجھ عنایت کرتا ہے اور ''عادلانہ نظام'' کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔[1]

معیشت کا نظام اور علم الاخلاق

اس طویل بحث کو اب اس طرح ترتیب دیجئے کہ ''انسان اگر اخلاق کریمانہ سے متصف نہیں ہے تو پھر وہ حیوانوں اور چوپاؤں سے بھی بدتر ہے اور اس آیت کا مصداق ہے:

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡوَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡوَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ [الاعراف۷:۱۷۹]

''ان کے دل ہیں پر سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں پر دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں پر ان سے سنتے نہیں، چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں۔ یہی ہیں جو غفلت سے سرشار ہیں۔''

اخلاق میں انفرادی اخلاق سے زیادہ اجتماعی اخلاق کا مرتبہ ہے۔ قرآن عزیز نے اگرچہ جدا جدا ہر ایک قسم کے اخلاقی اصول بیان کیے لیکن جس آیت کو جامع اخلاق کہا گیا اس میں ان ہی اخلاق کریمانہ کا ذکر ہے جو اجتماعی اخلاق کہلاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی﴾ [النحل۱۶:۹۰]

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور قرابت والوں کے ساتھ حسن سلوک اور داد و دہش کا۔''

پھر یہی آیت اس کے لیے بھی فیصلہ ناطق ہے کہ اجتماعی اخلاق میں بھی ''عدل'' کا درجہ بلند و بالا ہے اس لیے کہ ''عدل'' ہی سے احسان تک رسائی ہوتی ہے اور ''عدل'' ہی ''ایتاء ذی

---

[1] فیوض الحرمین، ص ۷۸

القربی'' کی توفیق بخشتا ہے اس لیے آیت میں اس کو اولیت کا شرف بخشا گیا۔ پھر ''عدل'' ہی اس چیز کو منصۂ شہود پر لاتا ہے۔ جس پر اجتماعی اخلاق بلکہ اجتماعی حیات کا مدار ہے یعنی ''نظام صالح''۔ بلاشبہ یہ ایک محور و مرکز ہے اور تمام اجتماعی مسائل اسی کے گرد گھومتے نظر آتے ہیں، صرف اسی کے وجود سے اجتماعیات کا وجود ہے اور اسی کے فساد وفنا میں اجتماعیات کا فساد وفنا مضمر ہے۔

الحاصل ان ہر سہ درجات و منازل کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عادل و صالح نظام کی صلاحیت اور اس کا فساد کس شے کے ساتھ وابستہ ہو؟ یہ بظاہر ایک بہت معمولی سوال ہے لیکن اپنی حقیقت کے پیش نظر بہت اہم اور اجتماعی حیات پر بہت زیادہ اثر انداز ہے۔ ارسطو کی کتاب الاخلاق اس کا جواب صرف یہ دیتی ہے کہ 'صالح نظام' کا وجود ''حصول سعادت'' پر موقوف ہے جو اخلاقیات کے لیے ''مثل اعلیٰ'' ہے لیکن ''سعادت'' کس طرح ہم کو ایک مکمل اجتماعی صالح نظام تک پہنچاتی ہے اس کا جواب ارسطو کے پاس نفی میں ہے البتہ وہ ''علم الاخلاق'' سے الگ ہو کر اس کا جواب سیاسیات میں دینے کی سعی کرتا ہے اور اس طرح ''نظام اجتماعی'' کو اخلاق سے جدا کر دیتا ہے۔

سقراط اور افلاطون کے یہاں بھی یہی حال نظر آتا ہے اور اسی طرح ان کے متبعین مسلمان فلاسفروں اور حکماء کا حال ہے۔ ابن سینا، فارابی، ابن مسکویہ، ابن رشد، اس سلسلہ میں یہ سب اسی سکول کو مانتے چلے آتے ہیں جس کی طرح یونانی فلاسفروں نے ڈالی تھی۔ امام غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم ابن عربی اور رومی اگرچہ اخلاقیات میں ایک مستقل اسکول رکھتے ہیں اور ان کے لیے بہترین نوامیس قائم کرتے ہیں تاہم اس سوال کے جواب میں ''عدل'' تک پہنچ کر وہ بھی خاموش ہو جاتے ہیں اور ان کا فکر اس سے اوپر پرواز کرتے کو تیار نظر نہیں آتا۔ لیکن اس سوال کا جواب امام الحکمت ''ولی اللہ دہلوی'' کے پاس موجود ہے، اور بلاشبہ انہوں نے ''صالح وعادل نظام'' کی صلاحیت کو جس اصل اور ناموس پر قائم کیا ہے وہ ان ہی کا طرّۂ امتیاز ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

''جب پارسیوں اور رومیوں کو حکومت کرتے صدیاں گزر گئیں اور دنیوی تعیش کو انہوں نے اپنی زندگی بنا لیا اور آخرت کو بھلا دیا اور شیطان نے ان پر غلبہ پالیا تو اب ان کی تمام زندگی کا

حاصل یہ ہے کہ وہ عیش پسندی کے اسباب میں منہمک ہوگئے اور ان میں کا ہر شخص دولتمندی اور تمول پر فخر کرنے اور اترانے لگا۔ یہ دیکھ کر دنیا کے مختلف گوشوں سی وہاں ایسے ماہرین جمع ہوگئے جو بیجا عیش پسندوں کو داد عیش دینے کے لیے عیش پسندی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے اور سامان عیش مہیا کرنے کے لیے عجیب وغریب دقیقہ سنجیوں اور نکتہ آفرینیوں میں مصروف نظر آنے لگے اور قوم کے اکابر اس جدوجہد میں مشغول نظر آنے لگے کہ اسباب تعیش میں کس طرح وہ دوسروں پر فائق ہوسکتے اور ایک دوسرے پر فخر ومباہات کر سکتے ہیں حتیٰ کہ ان کے امراء اور سرمایہ داروں کے لیے یہ سخت عیب اور عار سمجھا جانے لگا کہ ان کی کمر کا پٹکہ یا سر کا تاج ایک لاکھ درہم سے کم قیمت کا ہو یا ان کے پاس عالیشان سربفلک محل نہ ہوں جس میں پانی کے حوض، سرد وگرم حمام، بے نظیر پائیں باغ ہوں اور ضرورت سے زائد نمائش کے لیے بیش قیمت سواریاں حشم وخدم اور حسین وجمیل باندیاں موجود ہوں اور صبح وشام رقص وسرود کی محفلیں گرم ہوں اور جام وسبو سے شراب ارغوانی چھلک رہی ہو اور فضول عیاشی کے وہ سب سامان مہیا ہوں جو آج بھی تم عیش پسند بادشاہوں اور حکمرانوں میں دیکھتے ہو اور جس کا ذکر قصہ طولانی کے مترادف ہے۔ غرض یہ غلط اور گمراہ کن عیش ان کے معاشی نظام کی تباہی کا باعث بن رہا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ مملکت کی اکثریت پر یہ حالت طاری تھی کہ دلوں کا امن وسکون مٹ گیا تھا، ناامیدی وکاہلی بڑھتی جاتی تھی اور بہت بڑی اکثریت رنج وغم اور آلام ومصائب میں گھری نظر آتی تھی اس لیے کہ ایسی مفرطانہ عیش پرستی کے لیے زیادہ سے زیادہ رقوم اور آمدنی درکار تھی اور وہ ہر شخص کو مہیا نہ تھی۔ البتہ اس کے لیے پادشاہ، نواب، امراء اور حکام نے معاشی دست بردشروع کردی اور اس کا طریقہ یہ اختیار کیا کہ کاشتکاروں، تاجروں، پیشہ وروں اور اسی طرح دوسرے کارپردازوں پر طرح طرح کے ٹیکس عائد کر کے ان کی کمر توڑ دی اور انکار کرنے پر ان کو سخت سے سخت سزائیں دیں اور مجبور کر کے ان کو ایسے گھوڑوں اور گدھوں کی طرح بنا دیا جو آبپاشی اور ہل چلانے کے کام میں لائے جاتے ہیں اور پھر کارکنوں اور مزدور پیشہ لوگوں کو اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ اپنی حاجات وضروریات کے مطابق بھی کچھ پیدا کر سکیں خلاصہ یہ کہ ظلم وبداخلاقی کی انتہا ہوگئی تھی۔

اس پریشاں حالی وافلاس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو اپنی اخروی سعادت وفلاح اور خدا سے رشتہ وبندگی جوڑنے کے لیے بھی مہلت نہ ملتی تھی اور اس ''فاسد معاشی نظام'' کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ

جن صنعتوں پر نظام عالم کی بنیاد قائم ہے وہ اکثر یک قلم متروک ہوگئیں اور امراء ورؤساء کی مرضیات وخواہشات کی تکمیل ہی سب سے بڑی خدمت اور سب سے بہتر حرفہ شمار ہونے لگا۔ یہ سب اس مفاسد معاشی نظام کی بدولت پیش آیا جو عجم وروم کی حکومتوں میں کارفرما تھا۔ آخر جب اس مصیبت نے ایک بھیانک شکل اختیار کر لی اور مرض ناقابل علاج حد تک پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا اور اس کی غیرت نے تقاضا کیا کہ اس مہلک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اس کا قلع قمع ہو جائے، اس نے ایک نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا۔ وہ آیا اور اس نے روم وفارس کی ان تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم وروم کے رسم ورواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی۔ اس نظام میں فارس وروم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا کہ معاشی زندگی کے تمام اسباب کو یک قلم حرام قرار دیا جو عوام اور جمہور پر معاشی استحصال کا سبب بنتے اور مختلف عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر حیات دنیوی میں بیجا انہماک کا باعث ہوتے ہیں مثلاً مردوں کے لیے سونے چاندی کے زیورات اور حریر ودیبا کے نازک کپڑوں کا استعمال، اور تمام انسانی نفوس کے لیے خواہ مرد ہو یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال اور عالیشان کوشکوں اور رفیع الشان محلات وقصور کی تعمیر اور دکانوں میں فضول زیبائش ونمائش وغیرہ کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشاء ومولد ہیں۔

بہر حال خدائے تعالیٰ نے اس ہستی کو اخلاق کریمانہ اور نیک نہادی کا معیار اور ان پاک امور کے لیے میزان بنا دیا۔ اسی طرح شاہ صاحب ''ارتفاقات'' پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''یہ واضح رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا منشا اگرچہ بالذات عبادات الٰہی سے متعلق ہے مگر عبادات کے ساتھ ساتھ اس منشاء میں رسوم فاسد کو فنا کر کے اجتماعی زندگی میں بہترین نظام کا قیام بھی شامل ہو اسی لیے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے۔

''بعثت لاتمم مکارم الاخلاق''[۱]

---

[۱] جامع ترمذی، رقم الحدیث: ۱۴۲۵

میں اس لیے مبعوث کیا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں۔

اور اسی لیے اس مقدس ہستی کی تعلیم میں ''رہبانیت'' کو اخلاقی حیثیت نہیں دی گئی بلکہ انسانوں کے باہم اختلاط واجتماع کی زندگی کو ترجیح دی گئی ہے لیکن اس اجتماعیت کا امتیاز یہ قرار دیا ہو کہ اس کے معاشی نظام میں نہ دولت وثروت کو وہ حیثیت حاصل ہو جو عجمی بادشاہوں کے یہاں حاصل تھی اور ایسی کیفیت ہو کہ تمدن سے بیزار دہقان اور وحشی لوگوں کی طرح ان کی معیشت ہو پس اس مقام پر دو متعارض قیاس کام کر رہے ہیں۔ایک یہ کہ نظام معیشت میں دولت وثروت ایک محبوب ومحمود شے ہے اس لیے کہ اگر وہ صحیح اصول پر قائم ہو تو اس کی بدولت انسانوں کا دماغی توازن اعتدال پر رہتا اور اس سے ان کے اخلاق کریمانہ صحیح اور درست رہتے ہیں نیز انسان اس قابل بنتا ہے کہ دوسرے حیوانات سے ممتاز ہو۔اس لیے کہ بے کسی اور مجبوری پر مبنی افلاس سوء تدبیر اور مزاج کے اختلال کا باعث ہوتا ہے۔دوسرے یہ کہ نظام معیشت میں دولت وثروت ایک بدترین چیز ہے جبکہ وہ باہمی مناقشات اور بغض وحسد کا سبب بنتی اور خود اہل دولت وثروت کے اطمینان قلب کو تعب اور حریصانہ کدوکاوش کے زہر سے مسموم کرتی ہو اور قوموں کو استحصال بالجبر اور دوسروں پر معاشی دست برد کے لیے آمادہ کرتی ہو۔کیونکہ اس صورت میں یہ بداخلاقی کے مرض میں مبتلا کر دیتی،آخرت اور یاد الٰہی یعنی روحانی زندگی سے یکسر غافل وبے پروا بنا دیتی اور مظلوموں پر نت نئے مظالم کا دروازہ کھولتی ہے۔لہٰذا پسندیدہ راہ یہ ہے کہ دولت وثروت ''نظام معیشت'' میں ایسا درجہ رکھتی ہو جو توسط اور اعتدال پر قائم اور افراط وتفریط سے پاک ہو[1] اور یہ صحیح معاشی نظام کے بغیر ناممکن ہے''۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

اور یہ واضح رہے کہ اگر کسی شہر میں مثلاً دس ہزار انسان آباد ہوں تو ''سیاست مدن'' کے پیش نظر از بس ضروری ہے، کہ ان کی صنعت وحرفت اور کسب وتجارت پر بحث کی جائے اور ان کے معاشی مسائل کو زیر بحث لایا جائے۔

سو اگر اہل بلدہ صرف شہری سیاست ہی کے ادارے ہیں اور ان میں صنعت وحرفت کا

---

[1] مختصر از حجۃ اللہ، ج:۱ص ۱۰۴

توشوق ہو مگر وہ زراعت اور مویشیوں کی نگہداشت اور ترقی کی جانب سے بالکل بے پرواہ ہیں تو ان کی دنیوی ترقی خسارہ میں ہے۔

اس کے برعکس اگر ریاست کے شہری صنعت وحرفت، تجارت، زراعت شہری سیاست اور اس قسم کے معاشی وسیاسی امور میں ایسے طریق کار پر گامزن ہیں جو "حکمت" کے اصول پر مبنی ہے اور مناسب پیشوں کی ترویج کا باعث ہے نیز غیر مناسب اعمال اور شرعی واخلاقی نقطہ نظر سے قبیح اور بدنتائج کا موجب نہیں ہے تو اہل بلدہ کی دنیوی زندگی بہت خوب اور صحیح دوست ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بھی پیش نظر رہے کہ اگر کسی شہر یا ملک کے ذمہ دار اور سربراہ اور وہ ارکان معتدل معاشی نظام سے الگ ہوکر زیورات کی زیب وزینت، لباس کی نزاکت، عمارات کی بلندی ورفعت کھانے پینے کی اشیاء میں بے جا تعیش اور عورتوں کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے خارجی، زیبائش کی جانب راغب ہو جائیں اور ضروری حاجات اور مناسب ضروریات کی جگہ مصنوعی تعیش کو اختیار کرلیں جس طرح کہ آج کل عرب وعجم اس میں مبتلا نظر آتے ہیں تو پھر اکثر افراد ملک کا رجحان امور طبیعیہ میں تصرف کے ذریعہ بناوٹی جگمگاہٹ پیدا کرنے کی جانب ہو جائے گا تا کہ وہ ملک کے سربرآوردہ افراد کی خواہشات کی تکمیل کرسکیں اور اسی پر معاشی زندگی کا مدار ہو جائے گا۔

چنانچہ ایک جماعت اگر کنیزوں کو اور اس زمانہ میں خود اپنی لڑکیوں کی رقص وغنا کی تعلیم میں مشغول نظر آتی ہے تو ایک دوسری جماعت لباس میں قسم قسم کے نقش ونگار اور حیوانات واشجار کی تصاویر کی تزئین کرتی دیکھی جاتی ہے۔

اور ایک چوتھی جماعت عمارتوں کی زیب وزینت، ان کے مسرفانہ نقش ونگار، مینا کاری اور پچی کاری، رفیع الشان محلات وقصور کے نت نئے ڈیزائنوں کی فکر میں مصروف پائی جاتی ہے۔

پس جب کسی ملک یا قوم کا ایک بہت بڑا گروہ ان قسم کی مسرفانہ اور عیش پسندانہ صنعتوں میں منہمک ہو جاتا ہے تو پھر وہاں زراعت، تجارت، مفید صنعت وحرفت پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور جب قوم کے سرمایہ دار اور ذمہ داران اپنی پونجی کو ان غیر ضروری اور فضول صنعتوں پر بے دریغ صرف کرنے لگتے ہیں اور اپنے رجحان طبع کو اس طرح ضائع کرکے داد تعیش دینے لگتے ہیں تو وہ اپنے ملکی اور شہری مصالح کو برباد کرتے اور صحیح نظام معاش کو فاسد بناتے ہیں۔ اور اس کا قدرتی

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو ضروری حرفے اور پیشے ہیں یعنی زراعت، تجارت اور مفسد صنعت وحرفت ان کے لیے ماحول تنگ ہو جاتا ہو اور ان کے لیے راہیں محدود ہو جاتی ہیں بلکہ ان پر محاصل اور ٹیکس کا اس قدر بار بڑھ جاتا ہے کہ کس طرح وہ فروغ نہیں پا سکتیں اور یہ مضرت آہستہ آہستہ 'خارش کی وبا' کی طرح تمام افراد میں سرایت کر جاتی ہے اور معاشی نظام اور مدنی مصالح کو گھن لگ کر دنیوی زندگی کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اور روحانی کمال اور آخروی زندگی پر اس قدر برا اور مہلک اثر پڑتا ہے کہ نا قابل بیان ہے۔

یہی مہلک جراثیم تھے جو عجم وعرب کے جسم تمدن ومعیشت میں پیدا ہو کر اس کی دنیوی اور آخروی صحت وفلاح کو برباد اور ان کی اخلاقی حیات کو تباہ کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی محمد ﷺ کے قلب مبارک میں القا کیا کہ وہ اس مہلک مرض کا علاج کریں اور عجم وعرب کو تباہی اور ہلاکت سے نجات دیں۔ اور علاج کا ایسا طریق کار اختیار کیا جائے کہ مرض کی صرف اصلاح کو کافی نہ سمجھی جائے بلکہ اس فاسد مادہ کا ہی قلع قمع کر دیا جائے اور اس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے جو ان مہلک اثرات کا باعث ہے۔

پس ذات قدسی صفات نے اسی مصلحت کے پیش نظر اس قسم کے تمام معاشی اور تمدنی نظام کو ممنوع قرار دے دیا جو اس مرض کے پیدا ہونے کا سبب تھے مثلاً رقص وسرود کی تعلیم، مردوں کے لیے حریر ودیبا کے نازک لباس، سونے چاندی کی ایسی تجارت جو سود کا موجب بنی ہو اور سود وقمار وغیرہ۔ [۱]

شاہ ولی اللہ کے اس نظریہ کی صداقت کے لیے پرانی تاریخوں کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں موجودہ یورپی حکمرانوں کی تاریخ ہی اس کے لیے زندہ شہادت ہے۔

کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ جہاں تک انفرادی اخلاق کا تعلق ہے بعض یورپین اقوام اخلاقی مسائل میں بلند اخلاق اور مضبوط کیرکٹر کی حامل نظر آتی ہیں لیکن جب ان کی اجتماعی اخلاقی زندگی پر نظر ڈالیے تو غدر، فریب، بدعہدی، معاشی دست برد، استحصال بالجبر اور اسی قسم کی بداخلاقیوں کا گھر نظر آتی ہے۔ وہ معاہدات کرتی ہیں مگر بدعہدی کے لیے، مظالم توڑتی ہیں

---

[۱] حجۃ اللہ، ج ۲، ص ۱۰۵، ۱۰۶

آئین اور قانون کا نام لے کر، فریب کاریاں کرتی ہیں تدبر اور سیاست کہہ کر، معاشی دست برد کرتی ہیں مگر تجارت اور تہذیب آموزی کا پردہ رکھ کر۔ حتیٰ کہ انفرادی بداخلاقیوں میں سے بدکاری، شراب خوری اور عیاشی ان کا مایہ خمیر بن جاتی ہے۔

لیکن یہ سب کیوں ہے؟ صرف اس لیے کہ ان کے معاشی نظام کی بنیادیں جمہور کی حاجتوں کے پورا کرنے کے اصول پر استوار نہیں کی گئیں بلکہ اس سرمایہ دارانہ اصول پر قائم ہیں جس کو شاہ ولی اللہ کے نظریہ میں فاسد اور مذموم معاشی نظام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

پس جس حکمران قوم کا معاشی نظام رفاہیت افراد کا داعی اور معاشی دست برد کا حامل ہو اس قوم میں کبھی اجتماعی محاسن اخلاق پیدا نہیں ہو سکتے اور وہ قوم ہمیشہ اجتماعی بداخلاقیوں کا معدن ہوگی، کمزور اقوام کے لیے فتنہ بنے گی اور تکبر، ظلم، حق تلفی، دوسروں کی تحقیر وتذلیل اور خودغرضی وخوشامد پسندی جیسے مکروہ اخلاق اس کی فطرت ثانیہ بن جائیں گے۔

اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ جو قوم غلامی یا دوسرے اسباب کی بدولت ایسے معاشی نظام ہو جو مفید اور عادلانہ رفاہیت سے خالی اور محروم ہو تو وہ دوسری قسم کی اجتماعی بداخلاقیوں کا گہوارہ بن جائے گی اور اس میں ذلت نفس، قنوطیت یعنی ناامیدی اور یاس، عجز، بزدلی، افلاس اور گداگری جیسی بداخلاقیاں نمودار ہو جائیں گی۔

پس شاہ صاحب کے زیر بحث نظریۂ اخلاق کے پیش نظر اجتماعی اخلاق اور عادلانہ معاشی انتظام میں ایسا تلازم ہے جو کسی طرح ایک دوسرے کو جدا ہونے نہیں دیتا اور شاہ صاحب کی نظر میں اجتماعی اخلاق ہیں حسن وکمال جب ہی پیدا ہو سکتا ہے کہ حکومت کا معاشی نظام ایسے اعتدال پر ہو کہ جس میں بے باکانہ عیش پسندی کا دخل ہو، نہ افلاس اور فقر وفاقہ کا اور نہ وہ معاشی دست برد اور آئینی استحصال بالجبر پر قائم ہو اور نہ معیشت کے ترقی پذیر ذرائع سے خالی اور محروم ہو۔

حضرت شاہ صاحب فیوض الحرمین میں ایک مکاشفہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں نے رویائے صادقہ میں دیکھا کہ مجھ کو اللہ تعالیٰ نے نظامِ خیر کی تکمیل کے لیے اپنی منشاومراد کا آلۂ کار بنادیا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تمام مسلم ممالک پر کفار نے غلبہ کر کے اُن کو تہ وبالا کر ڈالا ہے۔ یہ دیکھ کر مجھ پر ایک غضب کی سی حالت طاری ہے اور میرے اردگرد رومی،

فارسی، ازبک اور عجم و عرب کے مسلمانوں کا جم غفیر جمع ہے کوئی گھوڑے پر سوار ہے تو کوئی اونٹ پر اور کوئی پیادہ اور وہ سب بھی میری طرح کفار کے اس غلبہ پر غضبناک نظر آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عرفات کے میدان میں بقصد حج جمع ہیں۔ آخر وہ میری جانب مخاطب ہو کر کہنے لگے مَاذَا حکم اللہ فی ھذہ الساعۃ (اس حالت کے پہنچ جانے کے بعد اب خدا کا فیصلہ کیا ہے؟ میں نے جواب دیا فك كل نظام موجودہ تمام نظامہائے عالم کو درہم برہم کر دینا۔"[۱]

امام الحکمت شاہ ولی اللہ کا اس سے یہ مطلب ہے کہ چونکہ اب عالم میں اسلام کا وہ بنیادی نظام باقی نہیں رہا جس کا جزو اعظم صحیح معاشی نظام ہے اور جو جمہور کے امن و اطمینان کا کفیل ہے تو اب تعمیر سے پہلے تخریب ضروری ہے اور اس کے بعد ہی اس عادلانہ نظام کے قیام کی توقع کی جا سکتی ہے۔

امام ابو یوسفؒ نے علم الاسرار کے معلم اوّل اور شاہ صاحب کے جدا امجد حضرت عمر بن الخطابؓ کا ایک مقولہ کتاب الخراج میں نقل کیا ہے جو امام الحکمت کے نظریہ کی تائید کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک ذمی یہودی کو بھیک مانگتے دیکھ کر فرمایا:

"وہ حکمران خدا کے سامنے سخت مواخذہ میں گرفتار ہوگا جس کی قلمرو میں ایک بھکاری بھی بھیک مانگنے پر مجبور ہو۔"

الحاصل امام الحکمۃ شاہ ولی اللہ دہلوی وہ پہلا فلسفی اور علم الاخلاق کا پہلا حکیم ہے جس نے دنیا کے سامنے یہ بیش قیمت نظریہ پیش کیا کہ کسی قوم کا اجتماعی اخلاق تک پہنچنا اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے نظام حکومت میں ایسا عادلانہ نظام قائم نہ ہو جو افراط و تفریط سے الگ عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں فلاح و خیر و امان و عافیت کا ضامن ہو۔ اور بلاشبہ ولی اللّٰہی حکمت و فلسفہ کا خصوصی امتیاز ہے کہ وہ معاشیات کو اخلاقیات کے ساتھ مربوط کرتی اور ان دونوں کے درمیان لازم و ملزوم کا رشتہ ثابت کرتی ہے۔

---

[۱] فیوض الحرمین، ص۸۹

فہم دین　　مولانا مفتی محمد شفیعؒ

اسلام میں اختلافات کی حدود اور منہج

مفتی تقی عثمانی صاحب کہتے ہیں کہ والد گرامی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے تھے کہ:

'کسی شخص یا جماعت کی حمایت ومخالفت میں جب نفسانیت شامل ہو جاتی ہے تو نہ حمایت اپنی حدود پر قائم رہتی ہے نہ مخالفت، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جس شخص کی حمایت کرنی ہو اسے سراپا بے داغ اور جس کی مخالفت کرنی ہو اسے سراپا سیاہ ثابت کرنے سے کم پر بات نہیں ہوتی۔ آج کل حمایت ومخالفت میں اس قسم کے مظاہرے عام ہو چکے ہیں، بلکہ بسا اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جس زمانے میں منظور نظر ہوا تو اس کی ساری غلطیوں پر پردہ ڈال کر اسے تعریف وتوصیف کے بانس پر چڑھا دیا گیا۔ اور جب وہی شخص کسی وجہ سے زیر عتاب آ گیا تو اس کی ساری خوبیاں ملیا میٹ ہو گئیں اور اس میں نا قابل اصلاح کیڑے پڑ گئے'

حضرت والد صاحب اس طرز فکر کے سخت مخالف تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اول تو یہ طریقہ حق وانصاف کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ اس حد سے گزری ہوئی حمایت ومخالفت کے نتیجے میں بسا اوقات انسان کو دنیا ہی میں شرمندگی اٹھانا پڑتی ہے....[حضرت والد صاحب کی نگاہ] دشمنوں اور مخالفین میں بھی اچھائیوں کو تلاش کر لیتی تھی اور ان کی خوبیوں کے برملا اظہار میں بھی آپ کو کبھی باک نہیں ہوا۔ بعض اوقات جب عام فضا کسی شخص یا جماعت کے خلاف ہو جاتی ہے تو اس کے بارے میں الزام تراشی اور افواہ طرازی کو عموماً عیب نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اس کے عیوب کی خبریں لانے میں لطف محسوس کیا جاتا ہے اور اس میں تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ حضرت والد صاحب ایسے مواقع پر اپنے متعلقین کو اس طرز عمل سے سختی کے ساتھ روکتے اور فرماتے کہ اگر ایک شخص کسی جہت سے برا ہے تو اس کا یہ مطلب کہاں سے نکل آیا کہ اس کی تمام جہات لازماً ہی بری ہوں گی اور اب اس کی بے ضرورت غیبت اور اس کے خلاف بہتان تراشی جائز ہو گئی ہے۔

اس ذیل میں حضرت والد صاحب نے یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے ایک صحابی

(غالبا حضرت عبداللہ بن عمرؓ) کے سامنے حجاج بن یوسف پر کوئی الزام لگایا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ یہ مت سمجھو کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم ہے تو اس کی آبرو تمہارے لیے حلال ہوگئی ہے۔ یاد رکھو کہ اگر اللہ تعالی حشر کے دن حجاج بن یوسف سے اس کے مظالم کا حساب لے گا تو تم سے اس ناجائز بہتان کا بھی حساب لے گا جو تم نے اس کے خلاف لگایا۔ (مفتی محمد تقی عثانی صاحب کی کتاب 'میرے والد میرے شیخ': 147-148)

بقیہ: رشتوں کو جوڑنے کی تحریک

فریقین کو واضح کرتے ہیں کہ یہ کیس اگر عدالت لے کر جاؤ گے تو کتنی دیر چلے گا، کتنا خرچہ آئے گا اور ممکنہ فیصلہ کیا آسکتا ہے۔ جب فریقین کو کچھ احساس ہو کہ وقت پیسے اور رشتوں کا نقصان ہوگا تو پھر وہ صلح کی جانب مائل ہوتے ہیں۔ اب تک سیکڑوں صلح کرا چکے ہیں، خاندان جوڑ چکے ہیں، بچوں کو ان کے والدین اکٹھے دے چکے ہیں اور بچوں کا بٹوارہ روک چکے ہیں۔ خاندانوں کی عزت، دولت اور رشتوں کی حفاظت کر چکے ہیں۔ ایک ٹی وی پروگرام میں ملاقات ہوئی تو بتا رہے تھے کہ اب تو یہ زندگی کا مشن بن چکا ہے۔ کوشش ہے کہ ایسے کئی مراکز قائم ہو جائیں۔ ہر شہر میں جگہ جگہ صلح کو عام کیا جائے۔ کئی بڑے ریاستی ادارے اب انہیں اپنے ہاں ایسے مراکز بنانے کی درخواست کر چکے ہیں۔

وہ اپنے ساتھ ٹیم بنا رہے ہیں اور ٹریننگ دینا چاہتے ہیں تاکہ صلح کرانے والوں کی مکمل تربیت ہو۔ پیغام یہی دیتے ہیں کہ خاندانی معاملات کو عدالتوں میں نہ لے کر جاؤ۔ وکلاء کے ہتھے نہ چڑھو، صلح کرلو۔ نرم ہو جاؤ، گھر بچا لو، خاندان بچا لو۔

یہی معاشرے کے ہیرے ہیں اور نامور و نادر لوگ جو زندگیوں میں خوشی، رشتے جوڑنے اور حقیقی تبدیلی کے لیے سرگرم عمل ہیں۔

CPL No. 296 Monthly Al Burhan June 2022

تدریس القرآن پراجیکٹ کے زیرِ اہتمام

سہ ماہی کورسز کا اجراء

ویک اینڈ پروگرام

برائے جدید تعلیم یافتہ حضرات، پروفیسرز، ڈاکٹرز، انجینئرز اور پروفیشنلز

بالخصوص یونیورسٹی طلبہ وطالبات اور اساتذہ

قرآن اور مغربی تہذیب

ہفتے کی شام: بعد نمازِ مغرب تا عشاء، 1.5 گھنٹہ

تدریس: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین (CEO)

قرآن اور تزکیہ وتصوف

اتوار کی صبح: 10:00 تا 11:30

تدریس: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین (CEO)

قرآنی عربی

اتوار کی شام: بعد نمازِ مغرب تا عشاء، 1.5 گھنٹہ

تدریس: حافظ عمران طحاوی (پی ایچ ڈی سکالر)

رجسٹریشن کے لیے واٹس ایپ نمبر
0300-4107282 پر میسج بھیجیں
کامیاب امیدواروں کو سرٹیفکیٹ دیے جائیں گے

کلاسوں کا آغاز وسط مئی ۲۰۲۲ء سے، ان شاءاللہ

زیرِ اہتمام: پروفیسر ایم اے رفرف (چیف آپریٹنگ آفیسر)

قرآن انسٹی ٹیوٹ

15۔ شیر شاہ بلاک، [عقب برکت مارکیٹ] کیپٹن سلمان سرور شہید روڈ،
نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور